



ایک ناگوار سی بو بیڈروم میں داخل ہوتے ہی اس کے نشتوں سے ٹکرائی تھی اور اس کے قدم بوہیں دہلیز پہ ہی ٹھک کر رک گئے تھے۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا دم ٹھک رہا ہو، اگر وہ پانچ منٹ اور وہیں کھڑی رہتی تو یقیناً چکر اے گر جاتی، اسی لیے وہ یکدم ہلٹی اور دروازہ کھول کر باہر جانے کو پہلی تھی۔
 ”رکو۔“ قلن افروزی بھاری گیمیر اور یو جھل آواز اس کے قدموں کی زنجیریں گئی تھی۔ وہ اس کی آواز پہ دروازے میں کسی بٹ کی مانند کھڑی رہ گئی۔ اس کا دایاں ہاتھ دروازے کے پینڈل پہ مضبوطی سے جما ہوا تھا جیسے اسے چھوڑ کر واپس پلٹنے کا کوئی ارادہ نہ ہو۔
 ”اوسر آؤ۔“ اس نے سر کے اشارے سے اسے قریب آنے کو کہا تھا، مگر وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی آگے یا پیچھے نہیں ہلی۔
 ”میں کہہ رہا ہوں، اوسر آؤ، میرے پاس۔“ وہ غصے سے دانت پیس کر بولا تھا لیکن وہ پھر بھی کس سے مس نہ ہوئی۔
 ”میں کیا کہوں اس کر رہا ہوں؟ تمہیں سنائی نہیں دے رہا۔۔۔؟“
 اس نے یکدم شیر کی طرح دھاڑتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا شیشے کا گلاس زور سے دروازے کی سمت دے

مکمل ناول



مارا تھا، وہ یکدم ایک سائیڈ پہ ہوئی تھی اور گلاس دروازے سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گیا تھا۔ گلاس میں موجود مشروب کے چھیننے اس کے پیروں پہ اور کپڑوں پہ گرے تھے وہ بیک کر دور ہٹ گئی۔

”دروازہ بند کر کے اصرار آؤ، میرے سامنے۔“ اس نے پھر سے آڑ دیا۔ اب کیا بارہ اس کے خطرناک تیروں سے کافی اچھی طرح باخبر ہو چکی تھی جب ہی دروازہ لاک کر کے اپنی سادہ اور نفیس سی چپل کے نیچے چھوٹے چھوٹے کالج خزان رسیدہ پتوں کی طرح روندتی ہوئی اس کے سامنے دفعہ تین سو دو کے مجرم کی طرح آن کھڑی ہوئی اسے پتا تھا کہ اب اس کی رہائی ناممکن ہو چکی ہے۔!

”واپس کیوں بھاگ رہی تھیں۔۔۔؟“ اس نے اسے سرٹاپا سرڈ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا لیکن جواب نہ دارو!

”گوئی اور بری کیوں ہو گئی ہو۔۔۔؟“ اسے ایک بار پھر تآؤ آیا تو زور سے اس کی کلائی پکڑ کر جھٹکے سے ٹھنکی اور وہ سلوٹے پتھر کی مورتی اس کے اوپر ہی آن گری کرتی ہی اس کی حس و حرکت بیدار ہو گئی۔ اس نے پوچھا کر پیچھے ہٹنا چاہتا لیکن اس کی کمر جکڑی جا چکی تھی۔ اس نے اس کا حصار توڑ کے ٹکنا چاہا لیکن یہ بھول گئی کہ گرفت اقلن افروز جیسے طاقتور مرو کی ہے۔!

”میں نے تم سے کہا تھا، ہر روز تلوآن بھرو گی تم کو اور ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔۔۔؟ تم ابھی سے بھاگنے لگی ہو۔۔۔؟ ابھی تو پوری زندگی بڑی ہے، کسے گزرے گی یہ زندگی؟“ وہ اس کا دپنہ اس کے گلے سے نکال کر دور پھینک چکا تھا اور وہ اس کی بات اور اس کے انداز پہ بھگتی تھی۔

”میں ہر تلوآن بھرنے کے لیے تیار ہوں، بشرطیکہ آپ ہوش و حواس میں ہوں۔ میرے کسی ناکرہ منہ کی سزا دینی ہے تو مجھ سے نظر ملا کر سزا دیں، آنکھوں پہ نشے کی ٹیٹی چڑھا کر نہیں۔۔۔“ وہ بھی جویا! اسی کے

لب و لہجے میں بولی تھی جس پہ اقلن افروز کا ہاتھ اٹھا اور پانچوں انگلیاں اس کے رخسار پہ ثبت ہو گئیں۔

”اور میں نے تم سے یہ بھی کہا تھا کہ کبھی پیروں والے زعم میں آکر مجھ سے بات مت کرنا، بات کرنی سے تو اپنی اوقات میں رہ کر بات کرنا ورنہ سارے زعم تو ڈر کر کھ دوں گا۔“

اس نے غرا کر اس یاد دلایا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔

”رونامت، نفرت ہے مجھے آنسوؤں سے۔“ ہر بات پہ پابندی تھی وہ گھٹ گھٹ کے رونا چاہتی، پھر بھی رو نہیں سکتی تھی۔

”جاؤ، اپنا جلدیہ درست کر کے آؤ۔“ اس نے سختی سے کہتے ہوئے یکدم اسے بازوؤں کے تنگ گھیرے سے آزاد کر دیا اور وہ تیزی سے اس کے سینے سے الگ ہوئی تھی ٹپوں جیسے کسی اذیت ناک اور ناقابل برداشت اسیری سے رہائی ملی ہو۔

”میں انتظار کر رہا ہوں، جلدی آؤ۔“ جانے سے پہلے ہی جلدی آنے کی تاکید کی جا رہی تھی۔ وہ دپنہ اٹھا کر تیزی سے ہاتھ روم میں گھس گئی۔ ہاتھ روم میں گھستے ہی اس کے سینے میں دلی سسکیوں اور آنکھ کے کناروں پہ ٹھہرے اشکوں کو راستہ مل گیا تھا وہ دیوار کی آئینہ کے سامنے کھڑی واش بیسن پہ دونوں ہاتھ جماکر جھکی ہوئی پچکیوں سے رو رہی تھی۔

اقلن افروز نجانے کس جہنم کا بدلہ لے رہا تھا اس سے۔۔۔ وہ بے بسی سے جتنا سوچی اتنا ہی رونا آگ۔ آخر وہ جاتی تو کہاں جاتی؟ کرنی تو کیا کرتی؟ ان دونوں نے اک دوسرے کو جو سمجھا تھا وہ غلط تھا۔!

☆ ☆ ☆

نچری پہلی اذان۔ ہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔! اس نے ذرا سی گروت بدل کر گردن موڑ کر بیڈ کے پائمن طرف دیکھا۔ وہ دیکھے سے سر رکھے اوندھا لینا بے حد گھری اور بے سدھ سو رہا تھا۔ اس وقت اس کے چہرے پہ اک بے خبری اور اطمینان کا عالم تھا۔ جس

روز اسے چوٹ لگتی تھی اس روز وہ پیروں پر تیرتا تھا اور پیروں سلکتا تھا، رات آنکھوں میں لگتی تھی اور آنکھیں عذاب میں لگتی تھیں اور یہی عذاب ماندہ کو اپنی ذات پہ جھیلنا پڑا تھا۔ اپنی روح پکٹا پڑتی تھی اپنی نسوانی انا کو مجروح کرنا پڑا تھا تب جا کے وہ پرسکون ہو کر سکون کی نیند سو رہا تھا۔ کل رات بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ اسے اپنی وحشت کا نشانہ بنا کے سکون سے سو رہا تھا اور وہ پھر بھی صبر کیے اپنی قسمت پہ شاکر تھی۔ نماز پڑھنے کے لیے اپنے ہال سمیٹتی ہوئی اٹھی تو نجانے کیوں گئے اوپر سے کبل ہنالتے ہوئے اس کی نظر اقلن افروز پہ ٹھہری گئی تھی۔

کتنا خوب صورت تھا وہ، مروانہ وجاہتوں سے مالا مال، شاندار شخصیت کا مالک، ایک مکمل مرد۔! لیکن اس مکمل مرو کی ذات ادھوری تھی، ہر بات ادھوری تھی، اس کی ہر بات ادھوری تھی اور یہی ادھور اپن اس کا ایک زخم، ایک ناسور بن گیا تھا جس کی تکلیف اقلن افروز کو کم اور ماندہ کو زیادہ ہوتی تھی بالکل ایسے جیسے اس وقت، وہ پوری تھی اور اپنی تکلیف کے احساس تلے، وہ اسے دیکھتے جا رہی تھی، جب اقلن افروز نے کروت بدلی اور اس کا ہاتھ ماندہ کی گود میں آ رہا تھا۔ وہ یکدم گھبرا گئی تھی کیونکہ اقلن افروز کا اس وقت نیند سے بیدار ہونا بھی عذاب سے کم نہیں تھا۔

اس کے بیدار ہونے سے یقیناً ”ماندہ کی نماز قضا ہو جاتی، جو اسے کسی بھی طور منظور نہیں تھا، اسی لیے وہ اس کے کروت بدلنے پہ دم سا دھ گئی، پھر اس کی گھری نیند کا اطمینان کر لینے کے بعد احتیاط سے اس کا ہاتھ اپنی گود سے ہٹایا اور خود آہستہ سے بیڈ سے اتر گئی۔ دوبارہ اس پہ کبل ڈال کر خود ہاتھ روم میں چلی آئی۔ پندرہ منٹ بعد لگی اور نماز پڑھنے کے لیے باہر چلی گئی، بیڈ روم میں پچھلی — تاکوار پوار اور لوا زیت کی کوچ سے اس کا بیڈ روم میں نماز پڑھنے کو دل نہیں چاہا تھا اسی لیے جائے نماز اٹھا کر نیچے آ گئی تھی۔

ذرا تنگ روم میں جلتے نماز بچھا کر نماز ادا کی، تسبیح

پڑھی اور دعا مانگتے کے بعد داوی بی کے کمرے کا رخ کیا۔

”اسلام علیکم داوی بی! صبح بخیر۔“ اس نے اندر آتے ہی انہیں سلام کیا وہ بھی جاگ رہی تھیں اور اسی کے انتظار میں تھیں کہ کب وہ آئے اور انہیں وضو کروائے، کیونکہ وہ خود سے نہ تو اٹھ سکتی تھیں اور نہ ہی چل پھر سکتی تھیں۔

”و علیکم السلام بیٹا! جیسی رہو، سدا سا گن رہو۔“ انہوں نے شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے دعا دی تھی۔

”آمین۔“ وہ ان کی دعا سمیٹتی ہوئی جھکی اور انہیں سارا دے کر وہیل پیئر پہ بٹھانے لگی۔

”جب سے تم اس گھر میں آئی ہو، میری کوئی بھی نماز قضا نہیں ہوئی، ورنہ تمہارے آنے سے پہلے اکثر

نہجری نماز قضا ہو جاتی تھی۔“

وہ ان کی وہیل چیرو دھکیلتی ہوئی ہاتھ روم کی سمت لے جا رہی تھی جب دواوی بی نے اس کی خدمت گزار پر تعریف کی تھی بلکہ احسان مانا تھا اس کا۔
”چلیں شکر ہے میرے آنے کا کوئی توفاندہ ہوا۔ میرے آنے سے یہ نیک کام ہوا ہے تو مجھے اور کیا چاہیے بھلا۔“ وہ ہلکے سے ہنسنے لگی۔

”ان شاء اللہ! اللہ تمہیں اجر دے گا۔“ دواوی بی ہر وقت اسے دعائیں ہی دیتی رہتی تھیں اور وہ ان کی انتہائی محبت، امانت اور اتنے خلوص پر ہمیشہ چپ ہو کر رہ جاتی تھی کیونکہ وہ اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتی تھی لیکن پھر بھی اس قابل بنادی گئی تھی۔
”اقلن رات کو کب آیا تھا؟“ دواوی بی نے پوچھا۔
”جلدی آگئے تھے۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

”تو پھر مجھ سے ملنے کیوں نہیں آیا؟“ انہیں اچھنبھا ہوا۔

”خواسوں میں نہیں تھے۔“ وہ مختصر سا کہہ کر رخ موڑ گئی تھی اور دواوی بی اس کے جواب کا مفہوم جان گئیں۔

پھر جب تک انہوں نے نماز اور ماندہ نے سارہ پڑھا تھا ان کے درمیان خاموشی ہی چھائی رہی لیکن جیسے ہی وہ ان کی وہیل چیرو دھکیلتی ہوئی باہر لان میں لے کر آئی، ان کی زبان پر رکے الفاظ بھی باہر نکلنے لگے تھے۔

”اس نے تمہیں کچھ کہا تو نہیں؟“ پہلا تشویش بھرا سوال آیا تھا۔

”کہہ بھی لیں تو کیا فرق پڑتا ہے؟“ اس نے سر جھٹکا۔

”فرق پڑتا ہے بیٹا! تم اس کی بیوی ہو، اسے تمہارا خیال کرنا چاہیے۔“ دواوی بی کو ماندہ اور اقلن افروز کی طرف سے پریشانی ہو رہی تھی۔

”خیال تو وہ تب کریں گے جب وہ ہوش میں ہوں گے۔ اور جب وہ ہوش میں ہوتے ہیں۔ تب وہ کھرہ

نہیں ہوتے۔“ وہ ذرا سی تکی سے بولی تھی۔

”میں نے تو سوچا تھا کہ شادی کے بعد بدل جائے گا وہ لیکن۔“ دواوی بی اپنی بات ادھوری چھوڑتے ہوئے چپ ہو گئیں۔

”یہ شادی میری اور آپ کی مرضی سے ہوئی ہے۔ اگر ان کی مرضی سے ہوتی تو شاید وہ بدل ہی جاتے۔“ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی اس لیے دواوی بی جواباً ”پچھ نہ کہہ سکیں۔“

”تم نے پوچھا نہیں کہ اس نے ڈرنک کیوں کی۔“ کلنی دیر بعد انہوں نے دوبارہ سوال کیا۔

”وجہ معلوم ہو تو پوچھنے کا فائدہ؟“ اس نے استہزاء انداز میں مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”لیکن ماندہ! میں تمہیں پہلے بھی سمجھا چکی ہوں کہ اسے اس کے حال پر مت چھوڑو! انٹر فیر کراس کی ذات میں۔ حق بتاؤ بیویوں والے انداز اپناؤ گے بتاؤ کہ تم اس کی ہو اور وہ تمہارا ہے۔“ دواوی بی اسے سمجھا رہی تھیں۔

”ہو نہ! میرے بتانے سے میں ان کی اور وہ میرے نہیں ہو جائیں گے، حقیقت کیا ہے یہ آپ بھی جانتی ہیں۔“ ماندہ نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے ان کی دھمکی ہوئی گرم چادر اٹھا کر ان کے گرد پھیلا دی۔

”لیکن بیٹا! یہ زندگی ہے جیسے یہ گزارنا چاہتا ہے ویسے زندگی نہیں گزرتی وہ تو باطل۔“

”پلیز دواوی بی! میں آپ کے لیے چائے لے کر آتی ہوں جب تک آپ یہ اخبار پڑھیں۔“ ماندہ نے ان کی بات کاٹتے ہوئے ان کی طرف اخبار بڑھادیا۔

سورج کی کرنیں سنہرا سنگھار کیے دھوپ کے گھنگھرو باندھے ہر محفل پر آگن میں دن بھر رقص کرنے کے لیے اتر چکی تھیں اور سرد موسم میں ان کے اس رقص سے جو لوگ مسرور ہو رہے تھے، ان میں دواوی بی بھی شامل تھیں داخلی دروازے کے سامنے وہ وہیل چیرہ بیسی اخبار پڑھ رہی تھیں جب ماندہ ان کے لیے چائے بنا کر لائی۔

”تھینک یو بیٹا۔“ انہوں نے نرمی سے کہ

ہوئے کپ اس کے ہاتھ سے تمام لیا تھا۔

”آپ بھی مکمل کرتی ہیں دواوی بی! یہ تو میرا فرض بنتا ہے، اس میں تھینکس کی کیا ضرورت ہے۔ بلکہ مجھے تو ایک کام کر کے خوشی محسوس ہوتی ہے۔“ وہ ایک کرسی کھینچ کر خود بھی ان کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔

”بیٹا! آج کل کوئی بھی اپنا فرض اور اپنا حق نہیں مانتا، بڑی جلدی آنکھیں پھیر لیتے ہیں سب۔ ایسے حالات میں اگر کوئی پھر بھی اپنا فرض پورا کرتا ہے تو اس کا شکر یہ ادا کرنا چاہیے۔“ وہ بھی جواباً ”سنجیدگی سے بولی تھیں۔“

ماندہ چن میں آگئی اسے اقلن کے لیے ناشتایار کرنا تھا۔ دواوی بی کے اور اقلن افروز کے کام وہ خود اپنے ہاتھوں سے سیر انجام دیتی تھی عیش و عشرت دوسرے کام کرواتی تھی۔



کلنی دیر ہو گئی تھی۔ وہ ابھی تک نیچے نہیں آیا تھا، اس لیے ماندہ کو خود ہی اوپر آنا پڑا۔ وہ دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی واش روم سے پانی گرنے کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ مشاوریہ رہا ہے۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھ کے کبل تہہ کر کے رکھنے لگی بیڈ پر جھکی وہ بیڈ شیٹ کی شکنیں دور کر رہی تھی جب واش روم کا دروازہ کھلا اور وہ تو لیے سے باہر گر کر تباہ ہوا ہوا آیا۔

”گڈ نارنگ۔“ وہ ماندہ کی موجودگی سے بے خبر ڈرینگ نیبل کی سمت بڑھ رہا تھا اس کی آواز پر چونک کر پلٹا تھا۔ وہ بازی رنگ کے جارنٹ کے ٹیس سی کڑھائی والے شلوار سوٹ میں ملبوس گھری سٹھری سی کھڑی ہاتھ میں پکڑا کٹن بیڈ پر رکھے دو ٹیکوں کے درمیان رکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر رات کے قہے کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اس کا چہرہ ابے مائٹ اور انداز بے نیاز سالک رہا تھا۔

اقلن افروز کی نظریں اس پر ٹھہری گئیں۔ نم آلود بالوں سے اس کی پوری کمر ڈھکی ہوئی تھی۔ اس کے

بال بے حد گھنے اور سیاہ تھے۔

”اب کیسی طبیعت ہے آپ کی۔“ وہ گلاس اور خالی مشروب کی بوتلیں ٹرے میں رکھتے ہوئے بولی تو اقلن افروز چونک گیا۔

”کیا ہوا ہے میری طبیعت کو۔“ میں تو بالکل ٹھیک ہوں؟“ وہ بے ساختہ حیرانی سے بولا۔

”ابھی ٹھیک ہیں ناں، رات کو ٹھیک نہیں تھے۔ رات کو تو آپ کی طبیعت خاصی خراب تھی۔“

”رات کو؟“ وہ اس کی بات کا مطلب سمجھ کے لب بھینچ گیا۔

”جی رات کی ہی بات کر رہی ہوں۔“ وہ زور دے کر بولی۔

”تم کتنا کیا چاہتی ہو۔“ وہ اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”جو آپ سمجھ نہیں پا رہے۔“ وہ استہزاء سے ہنسی اور اسی ہنسی پر غصے میں آکر اقلن افروز نے اس کا بازو دبوچ لیا۔

”میں کیا سمجھتا ہوں اور کیا نہیں۔“ تمہیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ سمجھیں تم؟“ اس نے ماندہ کے بازو کو جھنجھوڑا۔

”کیوں مطلب نہیں ہونا چاہیے؟ میں آپ کی بیوی ہوں ملازمہ نہیں۔“

”میں بیوی کو ملازمہ سے زیادہ کا درجہ نہیں دیتا۔“ وہ حقارت سے بولا تھا۔

”تو پھر شادی کیوں کی تھی؟“ ماندہ جانتی بھی تھی پھر بھی سوال کر رہی تھی۔

”کیونکہ ایک ملازمہ کی ضرورت تھی مجھے، میرے گھر کو، میری دواوی بی کو اس لیے ضرورت کے لیے کرنا پڑی۔“

”لیکن یہ ضرورتیں تو کوئی اور ملازمہ بھی پوری کر سکتی تھی۔“

”ہاں کر سکتی تھی لیکن صرف گھر کی ضرورتیں۔ میری ضرورتیں وہی ملازمہ پوری کر سکتی تھی جس کے ساتھ ”بیوی“ کا دم چھلا ہوتا۔“

”یہ کام تو عیشاں بھی کر سکتی تھی اسے بھی آپ ”بیوی“ کا دم چھلکا سکتے تھے؟“

”نہیں! اسے نہیں پہنا سکتا تھا کیونکہ وہ ایک سادہ سی نیند کی دیوانی اور اپنی ذات میں مست رہنے والی لڑکی ہے۔ تمہاری طرح اس نے بھی اقلن افروز پہ اور اس کے گھر پر ہی نظر نہیں ڈالی، جیسی حسرت سے نہیں دیکھا، میں کیا ہوں، اور کیا نہیں ہوں۔ اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتی ہے، بدلتی نہیں دکھائی۔“

اقلن افروز نے اس کی ذات کے رینچے اڑا دیے تھے۔ ماندہ کے چرے کی رنگت متغیر ہو گئی۔ اس نے مل بھر میں اس کا سارا زعم سارا غور توڑ کے رکھ دیا تھا۔ وہ جواباً ”کچھ کہنے کے قابل“ نہیں رہی۔

”تم کیا سمجھتی ہو کہ میں انجان ہوں۔ کیا میں نہیں جانتا کہ تم نے مجھ سے شادی کیوں کی؟“

اس نے ماندہ کی تحیر سے پھیلی ہوئی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے طنز پر انداز میں پوچھا تھا۔

”آپ واقعی نہیں جانتے کہ میں نے آپ سے شادی کیوں کی۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مجھے دولت کی ہوس تھی اور میں یہ سب آسائشات پانا چاہتی تھی تو یہی سب مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا مجھے آپ کا نام مل گیا میرے لیے یہی کافی ہے۔“

ماندہ اُس سے کسی ہوئی رخ موڑ گئی تھی، مبادا وہ اس کی آنکھوں میں آنسو نہ دیکھ لے۔

”تو پھر جھگڑا اس بات کا ہے؟ تم جیسا کہ تمہیں وہ مل گیا، وہ کافی ہے تو پھر خوش رہو، میرے معاملات میں انٹرفیر کیوں کرتی ہو؟“

”میں نے آپ کے معاملات میں انٹرفیر نہیں کیا، صرف آپ کی طبیعت پوچھی ہے۔“ ماندہ کالجہ ہنسیک رہا تھا۔

”مت پوچھو میری طبیعت، مجھ سے کچھ بھی مت پوچھو، کیونکہ میں بتاؤں گا نہیں۔“

وہ سختی سے کہہ رہا تھا اور ماندہ لب بچھ کر چپ ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کتنا روزا زہ پہ

دستک ہوئی تھی۔

”صاحب جی! بڑی نیگم صاحبہ نیچے بلا رہی ہیں، وہ ناشتے پہ آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔“ دستک کے بعد عیشاں کی آواز سنائی دی تھی جسے داوی بی نے پیغام دے کر بھیجا تھا۔

ماندہ آنکھوں کے گوشے ہاتھ کی پشت سے رگڑتی ہوئی باہر نکل گئی تھی اور اقلن افروز نے ہاتھ میں پکڑا ہوا تولیہ نفرت سے بیڈ پہ اچھال دیا اور ڈریسنگ میبل کے سامنے آکر اُٹھا ہوا۔

”ہونہ! یہ عورتیں!“

☆ ☆ ☆

وہ صبح نوجے آفس آیا تھا اور اس وقت شام کے چہرے بچ رہے تھے۔ وہ ابھی تک آفس میں ہی تھا۔ اسے مسلسل نوکھنے ہو چکے تھے کام کرتے ہوئے۔ لچ بھی نہیں کیا تھا صرف چائے اور سگریٹوں پہ گزارا ہوتا رہا تھا اور ابھی بھی بجائے اور کتنا مصروف رہتا کہ اچانک اس کے ایک دوست کا فون آیا۔

”ہیلو؟“ اس نے سگریٹ الیش ٹرے میں مسلتے ہوئے فون اٹھایا کی۔

”حسام بات کر رہا ہوں۔“

”جانتا ہوں، بولو؟“ اس نے لیپ ٹاپ کے کی بورڈ پر انگلیاں تلنے ہوئے پوچھا۔

”مہولہ کے فنکشن میں نہیں آرہے کیا؟“

”نہیں۔“ اس نے دو ٹوک لہجے میں انکار کر دیا۔

”ہوں! اچھے بھی تم سے یہی امید تھی بلکہ کئی لوگوں کو تم سے یہی امید تھی۔“ حسام نے طنز کیا تھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ اقلن افروز کی انگلیاں تھم گئیں۔

”کل شادی کے فنکشن میں تمہاری حالت بتا رہی تھی کہ تم دیکرہ انیڈ نہیں کرو گے اس لیے کہہ رہا ہوں۔“

”کیوں؟ کیا ہوا تھا میری حالت کو۔ ٹھیک ٹھاک ہی تو تھی۔“ وہ انجان بننے ہوئے بولا۔

”تم جتنے ٹھیک ٹھاک ہو، یہ پورا شہر جانتا ہے۔ تمہارے چلے جانے کے بعد بھی چہ میگوئیاں ہوتی ہیں لیکن تمہیں کچھ خبری ہو تب نہاں۔ تم تو دیوانے ہو گئے اور بس۔“

حسام کو کل رات سے غصہ تھا، اسی لیے اس کی کلاس لے رہا تھا۔ اسے اقلن افروز کا یوں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے فنکشن سے چلے جانا بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔

”میں اس محفل میں نہیں بیٹھ سکتا جہاں وہ بھی موجود ہو۔ مجھ سے برداشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تمہیں اگر میرا اتنا ہی خیال تھا تو تم نے اسے انوائٹ کیوں کیا تھا؟“ اقلن افروز کو حسام پہ غصہ آیا۔

”یار! ہم دونوں تو شروع سے دوست ہیں لیکن کچھ کاروباری دوست احباب بھی تو ہوتے ہیں ناں؟ انہیں بھی تو انوائٹ کرنا تھا اور تم جانتے ہو جمل بیروزادہ بھی میرے کاروباری دوست احباب میں شامل ہوتا ہے، مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے انوائٹیشن کارڈ بھیجنا پڑا تھا، لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ اس کے ساتھ۔“ حسام کہتے کہتے چپ ہو گیا تھا۔

”تمہیں پتا نہیں تھا لیکن اندازہ تو ہونا چاہیے تھا ناں۔؟“ اقلن افروز بمشکل اپنا غصہ ضبط کر رہا تھا۔

”اندازہ تھا، اسی لیے تو تمہیں مجھ بھی کو ساتھ لانے کے لیے کہا تھا۔“ حسام بے ساختہ بول گیا اور اقلن افروز اس کی بات پہ ٹھیک ٹھاک گیا تھا۔

”کیوں اسے تمہیں ساتھ لے کر آتا؟“ اقلن افروز کا لہجہ اور انداز ٹیکھا تھا۔

”ناکہ دوسروں کو بھی پتا چلا کہ تم شادی کر چکے ہو اور اپنی میز لائف میں بہت خوش ہو، تمہارے لیے کسی گاہو نایا نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔“

حسام کی بات پہ وہ حیران رہ گیا تھا۔ اس نے سختی گہری اور کٹنے کام کی بات کی تھی جو خود اس کی عقل میں آج تک نہیں آئی تھی۔

”دیکھو اقلن! صرف جلنا ہی نہ سیکھو، جلانا بھی سیکھو، جلنا فن نہیں ہوتا، کسی کو جلانا فن ہوتا ہے اور

تمہیں یہ فن نہیں آتا۔ کبھی آزاد کر دیکھو، بڑا لطیف پاؤ گے۔ تمہارے سینے میں جلتی آگ پہ پھوار برسے گی۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میرا نام بدل دیتا۔ اپنی لائف کو ایسا بناؤ کہ دیکھنے والے رنگ کر سں اور ہاتھ سے نکلے وقت پہ پچھتا میں۔ پچھتاؤ! اپنا مقدر بنانے سے بہتر ہے کہ کسی اور کا مقدر بنادو۔“ حسام نے اس کی سوچ کے کئی دروا کر دیے تھے۔ اقلن افروز کے دماغ میں جھماکا ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

شام کے سائے ڈھل چکے تھے۔ پوری کائنات پہ ملگیا سا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ وہ واپس گھر آ رہا تھا۔ سڑک پہ بھانگی دوڑتی گاڑیوں میں۔ اس کی گاڑی کی اسپنڈ سب سے زیادہ تھی کیونکہ وقت کم تھا اور اسے وقت پہ پہنچنا تھا۔ وہ کالی تیز ڈرائیونگ کر رہا تھا اسی لیے بڑی جلدی گھر پہنچ گیا تھا۔ چونکہ دار نے اس کی گاڑی دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا تھا۔ اس کی سطور کلر کی پراڈو فرار نے بھرتی ہوئی اندر گیٹ کے سامنے والی روش پہ آرکی۔ گاڑی سے اتر کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اندر آیا۔

”السلام علیکم۔“ اس نے ڈرائنگ روم میں بیٹھی داوی بی کو سلام کیا۔

”وعلیکم السلام۔“ داوی بی اس کے سلام سے ہی چونک گئیں۔ انہیں اس کا لہجہ بدلا ہوا محسوس ہوا تھا۔ ”کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“ وہ چند قدم چلتا ہوا ان کے قریب آیا تھا۔

”میری طبیعت تو ٹھیک ہے لیکن تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔“ داوی بی اس کے بدلے ہوئے تیور بھانپ چکی تھیں۔

”میں ٹھیک ہوں، وہ لڑکی کہل ہے؟“ اقلن افروز نے ماندہ کے بارے میں پوچھا لیکن کھڑائے ہوئے انداز میں۔

”کون لڑکی؟“ داوی جان تو چکی تھیں لیکن اس کے منہ سے اگوانے کے لیے جان بوجھ کر استفسار کیا تھا۔

”وہی لڑکی جو یہاں کام کرتی ہے۔“ وہ نام لینے سے گریز کر رہا تھا۔

”اچھا عیش کی بات کر رہے ہو۔۔۔ وہ کچن میں ہے۔“ انہوں نے کچن کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں میں دوسری لڑکی کی بات کر رہا ہوں۔“

”دوسری لڑکی کون ہے اس گھر میں۔۔۔“ وہ جھنجھلا کر بولی تھیں۔

”وہ کیا نام ہے اس کا۔۔۔ ہاں مائدہ اسی کی بات کر رہا ہوں۔“

”اوہ اچھا! تو یوں کہو ناں کہ تم اپنی بیوی کی بات کر رہے ہو؟ وہ جھلا کھس ہوگی؟ کچن میں کھانا تیار کر رہی ہے۔“ وادی بی بی نے بھی انہماک بننے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

”مجھے اس سے کام ہے میں بھی آتا ہوں۔“ وہ کہہ کر ڈرائنگ روم سے نکل آیا، اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

”بس بھی کریں چھوٹی بیگم صاحبہ! اس ہنڈیا کو اور کتنا بھونٹا ہے۔۔۔؟“ عیش کی آواز کچن سے باہر تک آ رہی تھی۔

”وادی بی بی تیار ہی تھیں جب تک ہنڈیا اچھی طرح بھنی ہوئی نہ ہو!“ قلن کو پسند نہیں آئی، وہ سالن یونی چھوڑ دیتے ہیں۔“

”خیر آپ صرف ہنڈیا کی ہی بات نہ کریں؟ میں تو لوگ بھی بھنے ہوئے ہی پسند ہیں اور جو بھنے ہوئے نہیں ہوتے انہیں وہ خود بھونک دیتے ہیں۔“ عیش مذاق اڑانے والے انداز میں بولی تھی۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے عیش! وہ صاحب ہیں تمہارے! ان کے بارے میں بات کرتے ہوئے تمیز سے کام لیا کرو۔“ مائدہ نے اسے فوراً ڈانٹ دیا تھا اسے عیش کا یوں مذاق اڑانا اچھا نہیں لگتا تھا۔

”سوری بیگم صاحبہ! میں تو بس۔۔۔“

”تم وادی بی بی سے اور مجھ سے کسی مذاق کر لیتی ہو یہی کافی ہے! لیکن اس سے زیادہ اور ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ مائدہ نے عیش کو اس کی حد

یاد دلادی تھی اور قلن افروز اس کا انداز دیکھتا رہ گیا تھا۔

”مائدہ۔۔۔!“ اس نے بمشکل اسے نام سے پکارا تھا اور چولہے کا شبن بند کرتی مائدہ اس کی آواز پر یکدم کرنٹ کھا کے چلی تھی اسے یقین نہیں آیا تھا کہ اسے قلن افروز نے پکارا ہے۔

”آپ نے مجھے بلایا ہے۔۔۔؟“ اس کی بے یقینی اس کے گیسے میں بھی ملانی ہوئی تھی۔

”ہاں! میرے ساتھ آؤ۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“

وہ سر ہلا کر کھتا ہوا واپس پلٹ گیا اور مائدہ ہاتھ میں پکڑا چھوٹا سا کٹر عیش کی کھمکے اپنا دوشہ درست کرتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔

”اللہ خیر!“ میٹر ڈھیاں چڑھتے ہوئے اس نے اللہ سے خیر کی دعا مانگی۔ دل عجیب سا دھڑک رہا تھا کیونکہ قلن افروز نے پہلی بار اسے پکارا تھا اور اس نے پہلی بار اس کا یہ روپ دیکھا تھا، اسی لیے دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے بمشکل اپنی تمام ہمتیں جمع کرتے ہوئے اندر کمرے میں قدم رکھا۔ وہ سامنے ہی منتظر کھڑا نظر آیا تھا۔

”جی۔“ وہ اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔

”میرے دوست حسام کو جانتی ہوناں۔۔۔؟“

”جی۔۔۔!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کل اس کی شادی تھی۔“

”تو۔۔۔؟“ مائدہ نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”آج اس کا ولیمہ ہے۔“

زندگی میں پہلی بار قلن افروز کو بات کرتے ہوئے مشکل پیش آ رہی تھی اس لڑکی کو جسے وہ ہمیشہ سے دھکارتا آ رہا تھا، اسے آج یوں ایک دم سے بیوی کا درجہ دینا اور اس طرح بات کرنا بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔

”پھر۔۔۔؟“ وہ یک لفظی سوال کر رہی تھی۔

”اس نے ہمیں ولیمہ کے فنکشن میں انوائٹ کیا ہے۔“ اس کی بات پر مائدہ نے ہلکی سی اٹھا کر براہ راست اس کی بو جھل آنکھوں میں دیکھا تھا۔

”اس نے تو غالباً ہمیں کل بھی انوائٹ کیا تھا؟“

”ہاں کیا تھا، لیکن کل میں جلدی میں تھا اس لیے اکیلا ہی چلا گیا۔“ اس نے بات ٹالی۔

”جلدی میں تو آپ اس وقت بھی ہیں؟“ مائدہ نے اسے لاجواب کر دیا تھا۔

”کیا ارادہ ہے تمہارا۔۔۔ کیا تم میرے ساتھ جانا نہیں چاہتیں؟“ اس نے ذرا گھبرا کر دھوک پوچھا۔

”جانے کو تو آپ مجھے جنم میں بھی لے جائیں گے تو ساتھ چلوں گی، انکار کا تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔“ وہ ہلکے سے سر جھٹک کر بولی۔

”تمہارے پاس فنکشن میں پہننے کے لیے ساڑھی ہوگی؟“ قلن افروز نے اپنی نفرت کا سر کچلتے ہوئے بمشکل سوال کیا۔

”آپ نے پہلے کبھی مجھے ساڑھی پہنے دیکھا ہے؟“

”لیکن آج میں ہمیں ساڑھی میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”ساڑھی میں دیکھنا چاہتے ہیں یا ساڑھی میں دکھانا چاہتے ہیں؟“ قلن افروز اس کی بات پر ٹھنک گیا تھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ اس نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا تھا۔

”میرے مطلب کو چھوڑیں، آپ اپنی بات کریں۔ کیا کہہ رہے تھے آپ؟“

”میرے ساتھ مارکیٹ چلو، کسی اچھے بوتھیک سے ساڑھی لے کر آتے ہیں۔“ مائدہ بہت کم ہے چلو میرے ساتھ۔“ وہ کہتے ہوئے دروازے کی سمت بڑھ گیا۔

”میں مارکیٹ نہیں جاؤں گی۔“ وہ اپنی جگہ پر کھڑی رہی۔ اس نے قلن افروز کے پیچھے قدم نہیں بدھائے۔

”کیوں؟“ وہ دروازے کے قریب جا کر رک گیا۔

”کیونکہ میں ساڑھی نہیں پہنوں گی۔“ اس نے صاف انکار کر دیا۔

”کیوں نہیں پہنوں گی؟ کیا برائی ہے ساڑھی پہننے میں؟“ وہ دوبارہ اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”تو اس میں اچھائی کیا ہے؟“ اس نے الٹا قلن

سے سوال کر ڈالا۔

”کیا؟ اچھائی کم ہے کہ یہ لباس مجھے پسند ہے میں تمہیں پہننے کے لیے کہہ رہا ہوں۔۔۔؟“ وہ اپنا مزاج ٹھنڈا رکھتے ہوئے دھمکے لہجے میں بات کر رہا تھا۔

”آپ نے صرف مجھے ساڑھی پہننے کے لیے کہا ہو تو شاید میں ساری زندگی ساڑھی اپنے تن سے جدا نہ کرتی، لیکن افسوس کہ آپ کی یہ فرمائش صرف میرے لیے نہیں ہے۔“

مائدہ نے اسے یکپارہ ڈالنا تھا اور قلن افروز اس کے اس لیکچر پر چونک گیا تھا۔

”آپ فیصلہ کر لیں۔ میں تب تک وادی کو بتا کر آتی ہوں کہ میں آپ کے ساتھ جا رہی ہوں۔“

وہ کہہ کے باہر نکل گئی تھی اور قلن افروز وہیں بیٹھ بیٹھ گیا تھا۔

وہ تیار ہو کر ریڈ روم سے باہر نکلی تھی کہ سامنے سے آتے قلن افروز کے قدم بری طرح ٹھٹک کر ٹھم گئے تھے۔ پہلی نظر میں تو وہ پہچان ہی نہیں پایا تھا کہ وہ عام سے جلے میں رہنے والی عام سی لڑکی مائدہ ہی ہے۔ قلن کی نظریں بے یقین تھیں شاید اس لیے کہ اس نے اسے اس طرح سر تپا پہلی بار دیکھا تھا ورنہ آج سے پہلے جب بھی اسے دیکھا تھا ہوش و خرد سے بیگانہ ہو کر دیکھا تھا۔ لٹے کی حالت میں تو اسے یہ بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ اچھی طرح لگ رہی ہے یا بری۔؟ لیکن آج اسے دیکھ کر لگ رہا تھا کہ ”وہ عام سی لگتی ہے پر عام سی ہے نہیں!“

وہ لفظی خاص ہے یہ تو وہ جانتا ہی نہیں تھا، اسی لیے تو اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سیاہ رنگ کے بے حد قیمتی اور نفیس سی لائٹ شرٹ اور چوڑی دار پاجامے میں لمبوس تھی۔ اس کے دوپٹے اور قمیص پہ سیاہ ہی رنگی دھماکے سے کلاہار بارڑنا ہوا تھا اور اس دھماکے کے کام میں کہیں کہیں سلور کالج کے موتی چمک رہے تھے جیسے کالی رات میں چمکتے ستارے۔ اس

نے ہم رنگ ہیل والی سینڈل پہن رکھی تھی۔ پالوں کو ہیرن کی مدد سے جیکھا سا ہیر اسٹائل دیا تھا اور ہلکے پھلکے میک اپ کے ساتھ اس کی شفاف دمکی جلد اور بھی جگمگا رہی تھی۔ چوہدری میں اس نے آویزے اور صرف برسلٹ پہنا ہوا تھا۔ اقلن افروز تو اس کی چھب دیکھتا رہ گیا تھا۔ وہ کتنی خوب صورت اور پرکشش لگ رہی تھی وہ اسے بتا بھی نہیں سکتا تھا۔

”چلیں۔۔۔؟“ مائدہ اسے ایک سی جگہ ٹھہرے دیکھ کر خود ہی قریب آگئی تھی۔

”ہوں! ہاں چلیں۔“ وہ چونک کر متوجہ ہوا تھا۔ مائدہ اس کے ساتھ بیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے آگئی۔

”خدا حافظ دادوی بی!“ وہ انہیں خدا حافظ کہنے ڈرائنگ روم میں آگئی تھی۔

”مشاء اللہ! اللہ نظر دے بجائے۔ اللہ میرے بچوں کی جوڑی سلامت رکھے۔ فی اللہ اللہ۔“

انہوں نے ان دونوں کی باتیں لے ڈالی تھیں اور انہیں دعاؤں میں رخصت کیا تھا۔

”میں نے حسام اور اس کی وائف کے لیے شادی کا گفت لیا تھا لیکن کل اسے دے نہیں سکا۔ گاڑی میں ہی رہ گیا تھا۔ اس لیے اب یہ گفت تم انہیں اپنی طرف سے دے دینا۔“ اقلن نے گاڑی کی پچھلی سیٹ پہ رکھے گفت کی طرف اشارہ کیا۔

”اپنی طرف سے۔ کیا میں اور آپ الگ ہیں۔۔۔؟“ مائدہ نے نکتہ اٹھایا۔

”کہہ سکتی ہو۔“ اس نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

”کہہ تو میں اور بھی بہت کچھ کہتی ہوں لیکن ڈرتی ہوں کہ آپ کو تکلیف نہ ہو۔“ اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

”میری تکلیف سے نہ ڈرو۔ اپنی تکلیف سے ڈرو کہ چہیں اپنے کیے سے سزا بھی مل سکتی ہے اور میری دی ہوئی سزا کو تم سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا۔“

”ہاں! اس معاملے میں تو واقعی خوش قسمت ہوں کہ آپ نے آج تک اگر سزا دی ہے تو صرف مجھے ہی

دی ہے۔ وہ بھی ان گناہوں کی جو میں نے نہیں کی اور نے کیے ہیں۔“ مائدہ کے لب و لہجے میں کتنی اتر آئی تھی۔

اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا اجالتک اس کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے سیل نکال کر دیکھا نمبر اجنبی تھا۔

”ہیلو اقلن افروز اسپیکنگ۔“ اس نے بہت نپے تلے اور شائستہ سے انداز میں کہا۔

”السلام علیکم بیٹا! کیسے ہو؟“ دوسری طرف کسی عورت کی آواز سنائی دی تھی لیکن وہ پہچان نہیں پایا تھا۔ اقلن کے لیے فون پر یہ آواز بکرا جیسی تھی۔

”وعلیکم السلام! میں ٹھیک ہوں، آپ کون ہیں؟“ اس نے ذرا الجھ کر پوچھا تھا۔

لیکن مائدہ کا دل اندر ہی اندر ہل رہا تھا۔ اس کی بے چینی اس کی ہتھیلیوں میں اتر آئی تھی۔

”بس بیٹا! اتنے دن ہو گئے تھے۔ مائدہ کی طرف سے کوئی خبر نہیں ملی، اس لیے سوچا آج خود ہی بتا کر لوں گا۔ فون پر سے تم لوگوں کے گھر کے نمبر پر فون کر رہی تھی لیکن کسی نے فون ہی نہیں اٹھایا، اس لیے پریشان ہو کر تمہارے نمبر پر فون کر دیا۔ اب پتا نہیں تم مصروف تھے یا فارغ، میں تو اپنی پریشانی میں تمہیں ڈسٹرب کر بیٹھی ہوں۔“

وہ شرمندہ سے لہجے میں بات کر رہی تھیں، اقلن افروز کو ان کی شرمندگی پر خود شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔ آج ذرا دیر کے لیے ہی سی وہ سرد مہمی کے خول سے نکلا ہوا تھا اس لیے محسوسات جاگے ہوئے تھے۔

تب ہی اسے شرمندگی کا احساس ہوا تھا۔

”نہیں! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم دراصل ایک فنکشن میں جا رہے ہیں۔ مائدہ بھی ساتھ ہی ہے۔ آپ اس سے بات کر لیں، میں ڈرائیو کر رہا ہوں، خدا حافظ۔“ اس نے ان کی جھجک اور شرمندگی محسوس کرتے ہوئے موبائل مائدہ کی طرف بڑھایا تھا۔ اور مائدہ نے بمشکل اپنے تاثرات کنٹرول کرتے ہوئے موبائل اس کے ہاتھ سے لے کر کلن سے لگایا تھا۔

”السلام علیکم امی!“ اس کا لہجہ بے حد دھیمہ اور آواز دہلی سی تھی۔

”وعلیکم السلام میری بچی! کیسی ہو۔ اتنے دنوں سے ماں کی کوئی خبر نہیں لی تم نے اور نہ ہی اپنا حال چال بتایا؟“

وہ بہت پیار اور محبت بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔ ان کی اداسی مائدہ کو ان کے لہجے سے ہی محسوس ہو گئی تھی۔

”بس گھر کے کاموں میں اور دادوی بی کے ساتھ وقت گزرنے کا بتا ہی نہیں چلا اور آپ کے پاس تو فون بھی نہیں ہے جس پہ کل کر کے میں آپ کی خبر خبر لے سکوں؟“

”خج صاحب کا فون ہے تو سی۔“ حلیہ بی بی نے سناختگی میں کہہ سکیں لیکن پھر خود ہی جب بھی ہو گئی تھیں لیکن اسی ذرا سی دیر میں مائدہ کے جسم کا سارا خون جیسے زرد پڑ گیا تھا۔ اس نے بے ساختہ ہاتھ میں پکڑے نشوے اپنی پیشانی اور چہرے سے ناویدہ پسینے کو تھپتھپاتے خشک کیا تھا۔

”ٹھیک ہے امی! آپ فون بند کریں۔ میں خود آپ کو کل کر لوں گی اس وقت ہم راستے میں ہیں۔“

اس نے فوراً انہیں ٹال دیا لیکن وہ اس کی کیفیت سمجھ گئی تھیں۔

”ٹھیک ہے اللہ تم لوگوں کو خیر و عافیت سے منزل پہ پہنچائے، ہم بعد میں بات کر لیں گے۔ اپنا خیال رکھا کرو، اللہ حافظ۔“ انہوں نے بھی بات کو طول دینے بغیر بات سمیٹ دی تھی اور مائدہ نے گہری سانس کھینچتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔ اور اپنے آپ کو پرسکون کرنے کے لیے اپنا سر سیٹ کی پشت سے ٹکا کر پلکیں موند لی تھیں اور اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا اقلن افروز بظاہر تو ڈرائیونگ میں ہی مصروف نظر آ رہا تھا لیکن اس کا دھیان مکمل تھا؟ مائدہ ہرگز نہیں جان سکتی تھی۔

”اپنی امی کی کل پہ تم اتنا گہرا کیوں گئی تھیں؟“ اس کے ٹھہرے ہوئے لہجے اور تبسم سے سوال پہ مائدہ نے گرت کھا کر پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور اقلن افروز کی طرف عجیب بدحواس اور متوحش سی نظروں سے دیکھا تھا گویا وہ اس کی کیفیت اور اس کے تاثرات سے اتنا انجان بھی نہیں تھا جتنا نظر آ رہا تھا۔ وہ اک نظر میں ہی اس کی کیفیت فوراً سمجھ گیا تھا۔

”کیا بات ہے۔ میرے سوال پہ تو تم اور بھی گہرا گئی ہو؟“ اس نے سامنے ونداسکرین سے نظریں ہٹاتے ہوئے مائدہ کے چہرے کو بغور دیکھا تھا۔

”نہیں نہیں! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“ اس نے فوراً نفی میں گردن ہلاتی تھی۔

”تمہارے چہرے سے تو ایسی ہی بات نظر آ رہی

ہے۔

وہ بڑے یقین سے کہہ رہا تھا۔ ساندہ نے اس کی پوجہ مگر گہری نظروں کے خوف سے پلکیں جھٹکی تھیں۔

”نہیں جس میرا ان کی تمنا کی اور اکیلے پن کی طرف خیال چلا گیا تھا۔“

”تمنا کی اور اکیلا پن؟“

”جی! دراصل جب میں ان کے پاس تھی تو انہیں بڑا سارا رہتا تھا۔ کام کاج بھی نہیں کرتا رہتا تھا اور اگر وہ بیمار ہوتی تھیں تو تب بھی میں ہی ان کی دیکھ بھال کرتی تھی، مگر اب تو ان کے پاس کوئی بھی نہیں ہے، سارا دن اکیلے گھر میں بیٹھے گزر جاتا ہو گا۔“ اپنی بات کی پریشانی کے خیال سے ہی ساندہ کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

”کیوں اکیلے کیوں۔ ان کے بہن بھائی میرا مطلب ہے کہ تمہارے والد صاحب وہ بھی تو ہوتے ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے بھی اکیلا پن ہوتا ہے؟“ اس نے ذرا سی حیرانی ظاہر کی۔

”جی! وہ اپنی شاپ پر ہوتے ہیں، صبح جاتے ہیں اور شام کو آتے ہیں اس لیے دن کا وقت تو اکیلے ہی گزرتا ہے نا؟“

”وہ تو ہر پڑوسی کا گزرتا ہے۔“

”لیکن جن بیویوں کے پاس بچے ہوتے ہیں ان کا وقت اچھا گزر جاتا ہے۔ جب میں ان کے پاس تھی تب ان کا وقت بھی اچھا ہی گزرتا تھا اب میری شادی کے بعد انہیں تمنا کی اور اکیلا پن محسوس ہونے لگا ہے۔“

ساندہ خود کو کافی حد تک سنبھال چکی تھی اس لیے آسانی سے بات کر رہی تھی۔

”ہوں! یہ بھی ٹھیک کہہ رہی ہو تم جن عورتوں کے پاس بچے ہوں وہ مصروف رہتی ہیں، بچے واقعی بہت پیارے اور۔“

اپنی دھن میں کچھ کہتے کہتے اسے نجانے کیا خیال

آیا کہ اس نے یکدم لب بھینچ لیے۔ اس کے تاروں سے چہرے پر سرد سائے کی کیفیت جم گئی تھی۔ ساندہ نے پلکیں اٹھا کر اس کی خاموشی پر اس کا بغور جائزہ لیا تھا۔ وہ جان چکی تھی کہ اس کی خاموشی کا سبب کیا ہے۔۔۔؟

ان دونوں کے ذہنوں میں اپنی اپنی اذیت کے جھکڑ سے چل رہے تھے اور وہ دونوں سوچوں کی تیز آمد و رفت میں بھٹکتے ہوئے اپنی زندگی اور اپنے حال سے کئی قدم پیچھے چلے گئے تھے۔ وہ ڈرا بیوہ کر رہا تھا اور وہ سیٹ سے سر نکالنے بیٹھی سامنے سڑک پر دیکھ رہی تھی۔!



حلیہ بی بی کو تقریباً ”تین گھنٹے ہو گئے تھے بازار گئے ہوئے لیکن ابھی تک ان کی واپسی کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا اور اس کی جان خشک پتے کی طرح لرز رہی تھی۔ وہ ایک ایک سیکنڈ منٹ اور گھبراہٹ کن رہی تھی۔ جیسے جیسے وقت آگے بڑھ رہا تھا اس کا خون خشک ہو رہا تھا اور ہتھیلیوں میں ٹھنڈا پسینہ اتر رہا تھا۔ دل عجیب سی گھبراہٹ کا شکار تھا۔ اس نے تین بار آیت الکرسی پڑھ کے خود پر چوم کی اور اللہ کی واپسی کی دعا کرنے بیٹھ گئی، ابھی چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ دروازے پر زور دار دستک ہوئی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ اس کی بدحواسی کا یہ عالم تھا کہ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ یہی پوچھ لے کہ باہر کون ہے۔۔۔؟ وہ کیوں کو یہی چیپ بیٹھی رہی، مگر دوسری بار دروازہ پہلے سے بھی زیادہ زور سے بجا تھا اور اب کی بار چیپ رہنا شکل تھا۔۔۔

”کون ہے؟“ اس کے حلق سے بمشکل آواز برآمد ہوئی تھی۔

”میں ہوں شیخ زنان! دروازہ کھولو۔“ باہر سے سنائی دینے والی آواز نے اس کے ہاتھ پیرن کر دیے تھے۔ وہ جس عفریت سے بچنے کے لیے تمام دروازے بند کیے بیٹھی تھی وہی دروازے پر کھڑی اسے دروازہ کھولنے کو

کہہ رہی تھی۔

”مم! کمر لیاں تو گھر پہ نہیں ہیں۔“ اس نے جیسے دروازہ نہ کھولنے کا بہانہ ڈھونڈا تھا۔

”اماں گھر پہ کیسے ہو گی۔ اماں تو باہر کھڑی ہے تیری۔“ شیخ زنان کی چٹائی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔

”باہر۔۔۔؟“ اسے یقین نہیں آیا تھا۔

”ساندہ! دروازہ کھولو بیٹا! کیا بحث لگا رکھی ہے۔۔۔؟“

باہر سے اماں کی آواز سنائی دی تو اس کے جسم میں ٹوٹی ہوئی جان دوبارہ سے سرایت کر گئی تھی اور پلک جھپکتے میں اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا تھا اور دروازہ کھلتے ہی جہاں اماں نے اسے تجب آہیں نظروں سے دیکھا تھا وہیں شیخ زنان نے اسے بڑی خشکیوں نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ اپنی پسینے سے نم آلود پیٹلی دوڑنے سے پوچھتی ہوئی سامنے سے ہٹ گئی۔ وہ دونوں اندر آ گئے تھے۔

”کیا بات ہے؟ دروازہ کیوں نہیں کھول رہی تھیں؟“ اماں نے ہاتھوں میں پکڑے پھیلے برآمدے میں بچھے تخت پر ڈھیر کر دیے تھے۔ سودا سلف کافی زیادہ تھا اس لیے ان کے بازو جھک چکے تھے۔ ساندہ فوراً ”پاورچی خانے میں جا کر ان کے لیے پانی لے آئی تھی۔“

”تمہاری اماں پوچھ رہی ہیں کہ تم دروازہ کیوں نہیں کھول رہی تھیں۔۔۔؟“ اس کی خاموشی پر شیخ زنان نے جان پوچھ کر اماں کا سوال دہرایا۔

”وہ میں سمجھی کہ آپ کی دکان سے کوئی لڑکا آیا ہے کسی کام سے اور اماں کا پوچھ رہا ہے اسی لیے میں نے کہہ دیا کہ اماں گھر پہ نہیں ہیں۔“ اس نے بروقت بہانا ترتیب دیا تھا۔

”حالانکہ میں نے خود بول کر بتایا تھا کہ میں ہوں شیخ زنان؟“ شیخ زنان نے اپنی بات پر زور دے کر کہا تھا۔

”میں نے سنا نہیں تھا۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو۔۔۔؟“ اماں کی سانسیں ہمار ہو میں تو بیٹی کے چہرے کی سمت دیکھنے کا

خیال کیا تھا۔

”نن۔۔۔ نہیں میں بھلا کیوں گھبراؤں گی۔۔۔؟“ اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا اور نظریں چرائی تھیں۔

”آج گرمی بہت ہے، بار بار پیسہ آ رہا ہے اچھا ہو۔۔۔ آپ پہلے آگئیں ورنہ میں تو نہانے جا رہی تھی اور آپ کئی میں کھڑی ہو کے میرا انتظار ہی کرتی رہتیں۔“

وہ بات کو ادھر ادھر بانتی ہوئی کرے سے اپنے کپڑے اٹھا کر ہاتھ روم میں گھس گئی کافی دیر ٹھنڈے پانی سے شاور لینے کے بعد اس کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے اور دل و دماغ بھی پرسکون ہو چکے تھے کیونکہ اب اسے کوئی ڈر اور کوئی خوف نہیں تھا۔ اب اماں جو گھر پہ تھیں۔ لیکن شیخ زنان کی فرمائش نے اس کا سارا سکون غارت کر ڈالا تھا۔ اس کے اعصاب میں پھر سے تناؤ آ گیا تھا۔

”حلیہ! میں اندر کرے میں پکے کے نیچے بیٹھتا ہوں، تو ایک گلاس شربت کا بنوا کے اندر کرے میں بیچ دے۔“ آج گرمی بہت ہے، بار بار پیاس لگ رہی ہے۔

وہ ساندہ اک چھیدی ہوئی نظر ڈال کے اندر چلا گیا تھا اور ساندہ تھملا کے رہ گئی ظاہر ہے اماں تھکی ہوئی آئی تھیں وہ بھلا شربت کیسے بنائیں۔۔۔ شربت تو اسی نے بنانا تھا اور کرے میں اسے دے کر بھی اسی نے آنا تھا۔ یہی سوچ کر وہ بیروں کے ٹکڑے سے سر کی چوٹی تک جل اٹھی تھی۔ انکار کرنا بھی فضول تھا۔ یقیناً وہ تھوڑی دیر بعد کوئی اور کام کہہ دیتا۔ اس لیے بہتر تھا کہ وہ شربت ہی بنا دیتی۔

اس نے زنج ہو کر مٹھیاں اور لب بھینچ لیے تھے اور قدم باورچی خانے کی سمت بڑھا دیے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے خود بہ جبر کرتے ہوئے شربت بنایا اور شیخ زنان کے کمرے میں پہنچا آئی تھی لیکن اس آنے اور جانے کے دوران ساندہ کو لگا کہ شیخ زنان کی ہوس زندہ نظریں اس کے جسم کے ساتھ چپک کے رہ گئی ہوں اور

ان نظروں نے اسے غلط، ٹپاک اور گنداکر رکھ دیا ہو۔ اس کی چھیدتی ہوئی نظریں ماندہ کی روح کا عذاب بن چکی تھیں اور اسی عذاب کے احساس سے وہ اندر ہی اندر کلس کے رہ جاتی تھی۔ بے بسی بے پناہ تھی، کوئی راہ فرار نہیں تھی!

رات کے سوا بارہ بجے کا وقت تھا لیکن وہ ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ اور داوی بی ڈرائنگ روم میں بیٹھی پیش کی طرح اس کے انتظار میں تھیں۔ مطالعہ کرنا ان کا بہت پرانا شوق تھا، جو بچپن سے جوانی، جوانی سے بڑھاپے اور غربی سے امیری تک ان کے ساتھ آیا تھا اور ان کے اسی شوق کی خاطر ان کے اکلوتے اور لاڈلے پوتے نے انہیں گھر میں باقاعدہ ایک چھوٹی سی لائبریری بنادی تھی۔

البتہ ان کے دل میں کچھ اور خواب، کچھ خواہشیں اور کچھ ارمان بھی ہیں یہ جاننے کی اس نے کبھی زحمت ہی نہیں کی تھی۔ وہ ان کے وہی شوق پورے کرنا تھا جو اس کی اپنی ذات سے منسوب نہیں ہوتے تھے اور داوی بی کو بھی اسی بات کا قلق رہتا تھا کہ وہ ان کی ہر بات ماننا ہے۔ ہر طرح کا خیال رکھتا ہے لیکن اس معاملے میں اگر لاپرواہی، بے نیازی اور سرد مہمی برت جاتا ہے۔ ان کے دل کے ارمانوں اور خواہشوں سے نظریں چراکے گزر جاتا ہے یہ احساس کیسے ہنا کہ ان کی عمر ایسی نہیں تھی جہاں وہ ارمانوں کے پورا ہونے کا انتظار کرتیں، ان کا تو یہ معاملہ تھا کہ آج ہیں، کل نہیں۔

اس نے تول کو پتھر اور احساسات سے عاری کر لیا تھا اور اسی لیے وہ رنجیدہ اور غم زدہ رہتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ اسی کا انتظار کر رہی تھیں اور وہ تھا کہ جیسے شہر ہی چھوڑ گیا تھا بالآخر وہ خود ہی انہیں اور فون سیٹ کے پاس آگئیں۔ اس کا نمبر ڈائل کیا اور ریسیور کلن سے لگا لیا۔ دوسری طرف تیل جاری تھی لیکن وہ کوئی کل ریسیور نہیں کر رہا تھا پھر بھی وہ مسلسل کوشش کر

رہی تھیں اور ایک بار ان کی کوشش کامیاب ٹھہری گئی۔
”ہیلو!“ اس کی بھاری گنجھیر اور بوجھل آواز پر ان کا دل کٹ کے رہ گیا تھا۔
”اگلن!“ وہ بڑے دکھ سے بولی تھیں۔

”ڈونٹ وری! میں آ رہا ہوں۔“ اس نے مختصر سے الفاظ میں کہہ کر فون بند کر دیا اور وہ بند ریسیور کو دیکھتی رہ گئیں۔ ان کی بوڑھی آنکھوں میں دکھ سے آنسو آ گئے تھے۔ اب وہ اسے کیا کہیں کہ وہ انہیں بڑھاپے میں ستا رہا ہے۔ انہیں بے وجہ اذیت دے رہا ہے، ان کے دل پر رنج کا بوجھ بڑھا رہا ہے لیکن اگر وہ اسے کہہ بھی دیتیں تو اس پر بھلا کیا اثر تھا۔ وہ مثل مثل کر جھٹکنے لگی تھیں جب باہر گٹ پگاڑی کارنر سٹانی دیا تھا پھر ذرا توقف سے گیٹ کھلنے اور گاڑی کیراج میں رکنے کی آواز سنانی دی تھی۔ رفتہ رفتہ کارڈور سے بھاری قدموں کی چاپ ابھرتی ہوئی قریب آتی چلی گئی تھی اور ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے پر آکر یہ چاپ بھی ٹھہر گئی، انہوں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا تھا۔
”خیریت؟ آپ بار بار فون کر رہی تھیں؟“ مختصر سے الفاظ میں پوچھا گیا۔

”کیا تمہیں نہیں پتا کہ میں کیوں بار بار فون کر رہی تھی؟“ انہوں نے خفگی سے کہا۔
”آئی ایم سوری! میں بڑی تھا۔“ پہلے سے بھی مختصر جواب آیا۔

ثم فارغ کب ہوتے ہو؟ ایک داوی رات بھر پوتے کے لیے جاگ کر اس کی واپسی کی راہ دیکھتی ہے اور پوتا آ کے پوچھتا ہے۔ ”آپ کو کوئی کام تھا تو بتائیں۔“

وہ بڑے دکھ اور کرب سے بولی تھیں لیکن پوتے کو شرم کب تھی بھلا؟

”تو پھر کیوں جاگ رہی ہیں؟ ہزار بار کہہ تو چکا ہوں کہ میرا انتظار مت کیا کریں۔ دل چاہے گا تو کھراؤں گا، ورنہ نہیں آؤں گا، آپ کب تک اپنی بوڑھی ہڈیوں کو میرے انتظار میں لٹکائے رکھیں گی؟ آپ

جس اگلن افروز کے انتظار میں بیٹھی ہیں، وہ تو کب کام چکا ہے اب کبھی نہیں آئے گا۔ مت کیا کریں اس کا انتظار۔“ وہ یکدم غصے سے پھٹ پڑا تھا۔
”وہ تھی تو تمہیں سب سے محبت تھی، وہ چلی گئی تو ساری محبتیں بھی چلی گئیں کیا تمہیں اب اپنی دادی بھی بری لگنے لگی ہے۔ اگر ایسی ہی بری لگتی ہوں تو اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دو اور اکیلے رہو اس گھر میں، تاکہ نہ تمہیں میری پرواہ کرنی پڑے اور نہ مجھے تمہاری فکر ہو۔“ وہ رو رہی تھیں اور وہ لب بچھنے کے رہ گیا تھا۔

”ہاں میرے اندر کی ساری محبتیں مر چکی ہیں، ہر احساس مر گیا ہے، کسی کی پروا نہیں رہی مجھے، اور یہ بات آپ خود اچھی طرح جانتی ہیں اور آپ یہ بھی یاد رکھیں کہ اگلن افروز اس وقت زندگی جی نہیں رہا، زندگی بھار رہا ہے، صرف اس لیے کہ کہیں میری موت کو وہ اپنی بے وفائی کا صدمہ نہ سمجھ لے ورنہ مرقومیں اسی روز گیا تھا جس روز وہ۔“ کتے کتے اچانک اس نے لب بچھنے لیے اس کی زبان کو زب نہیں دیا تھا کہ وہ بات مکمل کرنا۔

”لیکن دنیا اس لڑکی ختم نہیں ہو جاتی۔“
”داوی بی! ساری باتیں ساری حقیقتیں جانتی تو ہیں آپ۔ پھر کیوں بھول جاتی ہیں میری دنیا اس لڑکی پر ہی ختم ہوتی تھی اور اس لڑکی پر ہی ختم ہو گئی؟“ وہ بولا مگر تلخ اور استغریہ سے۔

”پلیز داوی بی! اب اس ٹاپک کو ہمیں ختم کریں رات کے اس پہر کچھ حاصل نہیں ہو گا سوائے سردرد کے۔“ اس نے سختی سے کہتے ہوئے انہیں روک دیا تھا اور پلٹ کر میزبھوں کی سمت بڑھ گیا۔

”اگلن!“ وہ بے بسی سے زچ ہو کر پکاریں۔
”پلیز مجھے کی کوشش کریں داوی بی! ان باتوں کے لیے یہ وقت موزوں نہیں ہے۔ یہ ساری باتیں کسی اور وقت اٹھا رکھیں۔ اس وقت گری نیند آ رہی ہے، آپ بھی سو جائیں اور مجھے بھی سوئے دیں۔“
اس نے ہاتھ اٹھا کر بے نیازی سے کلا اور میزبھیاں

چڑھ گیا تھا اور وہیں کھڑی دیکھتی رہ گئیں۔ وہ واقعی بے حس ہو چکا تھا، اب تو ان کی بھی پروا نہیں کرتا تھا ورنہ پہلے تو۔!

وہ دلی سے پورے لان کی کانٹ چھانٹ کر وا کے پودوں کو پانی دے کر فارغ ہوئیں تو اچانک انہیں وقت کا احساس ہوا تھا کیونکہ انہوں نے ابھی اگلن کے لیے ناشتا بھی بنانا تھا اس لیے سارے کام وہیں پشت ڈالتے ہوئے اندر آگئیں عیشیل ڈرائنگ روم اور بی وی لاؤن کی صفائی میں مصروف تھی۔

وہ شروع سے ہی اگلن افروز کے لیے کھانے پینے کی اشیاء خود تیار کرتی تھیں اس کے سارے کام وہ اپنے ہاتھوں سے کرتی تھیں۔ ناشتا بنا کر انہوں نے عیشیل سے کہا۔

”اوپر جاؤ اور اگلن سے کہو ناشتیار ہو چکا ہے، جلدی آجائے ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔“ انہوں نے عیشیل کو اوپر بھیجا اور وہ سڑب سے انداز میں سر ہلا کر اوپر چلی گئی اور وہ خود اس کا ناشتا لگانے میں مصروف ہو گئیں۔

اور ٹھیک باغ منٹ بعد وہ شاندار ڈرائنگ کے عمدہ خوشبو لگائے، خوب صورت، ہیرا شائل مگر سرد سپاٹ چرے کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تھا۔

”گڈ مارننگ۔“ بے تاثر سا اجہ تھا، وہ بھلا کیا جواب دیتیں، خاموشی سے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی تھیں، وہ بھی ان کی خاموشی نوٹ کر چکا تھا کیونکہ ان کی طرف سے اس کی ”گڈ مارننگ“ کا کوئی جواب نہیں آیا تھا انہوں نے جوس کا جگ اور گلاس اس کے سامنے رکھ دیا تھا، وہ نارمٹ جوس پیئے کا عادی تھا۔

”آئی ایم سوری۔“ اس نے گلاس اٹھاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا لیکن داوی بی نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اپنے لیے کپ میں چائے انڈیلنے لگیں۔

”شاید رات میں کچھ زیادہ بول گیا تھا، مجھے اتنا نہیں

وہ جس پینے سے پہلے سر جھکائے آہستگی سے اور
سجیدگی سے معذرت کر رہا تھا لیکن داوی بی نے اس کی
کوئی بھی بات کاٹوں پہ نہیں دھری تھی جس پہ وہ
قدرے جھنجھلا گیا تھا۔

”مجھ سے کیوں مخاطب ہو؟ اور کیوں سوری بول رہے ہو؟ کیا انیت ہے میری تمہاری نظر میں؟ جیسے گھر کے باقی ملازم ہیں ویسے میں بھی ہوں، میں اتنا فرق ہے کہ وہ کوارٹرز میں رہتے ہیں اور میں تمہارے گھر کے بیڈ روم میں رہتی ہوں۔ تمہارا بچہ یہی احسان ہے کہ تم نے مجھے ایک کمرادے رکھا ہے، ورنہ روٹی پانی، جوتی، کپڑا تو باقی سب کو بھی مل رہا ہے۔ وہ بھی کام کرتے ہیں، میں بھی کام کرتی ہوں۔ جب ان کاموں سے ہٹ کے کوئی بات کرتی ہوں تو تمہیں ناگوار گزرتا ہے۔ آخر کو تم مالک ہو، کسی ملازم کی اپنی ذات میں مداخلت ناگوار تو گزرے گی۔ لیکن تم بے فکر ہو، آئندہ ایسا نہیں ہو گا، میں پوری کوشش کروں گی کہ تمہارے کسی بھی کام میں مداخلت نہ کروں جو تمہیں ناگوار گزرے۔“ انہوں نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا اور سن موڑ لیا تھا۔

”مت کو مجھے داد دی لی۔ میں صرف نام کی داد لی لی
ہوں، ورنہ میری کیا وقت بے خوب جانتی ہوں میں۔
تمہارے لیے وہی اہم تھی جس کے ہجر میں جو کی بنے
پھر رہے ہو۔ وہ مٹی تو سب کچھ گیا، پوری دنیا ہی ختم ہو
گئی اور جب تمہاری دنیا ہی ختم ہو گئی ہے تو ہم کس کلام
کے“

ناجائز اور غلط کام کرو۔ گھر آؤ یا نہ آؤ میں تمہاری پروا نہیں کروں گی۔ بھول جاؤں گی کہ میرا کوئی پوتا بھی ہے بس زندگی کے دن پورے کرنے ہیں عمو ہو، جی جی ہیں۔ تم خود مختار ہو اپنی مرضی کے مالک ہو جو چاہے کرو۔ میری طرف سے آزاد ہو۔“

ناتوا میں اوجھڑا رہا کیا تھا۔ اقلین نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ آج تک اس نے جو کچھ بھی کیا تھا یا جو کچھ بھی ہوا تھا وہ بھی اس سے اس طرح خفا نہیں ہوئی تھیں۔ کبھی غصہ نہیں کیا تھا، کبھی مشعل نہیں ہوئی تھیں اور آج اگر وہ مشعل اور برہم ہوئی تھیں تو اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ آج واقعی کوئی ایسی چٹ لگی ہے جس کا اثر ان کے دل پہ ہوا ہے۔ ورنہ وہ اپنے لاڈلے بچے کو اس طرح ڈانٹ دیں۔ کبھی بھی ہونے نہیں سکتا تھا۔

اور اسی بات پر اقلن افروز کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وادی لی نے اتنا غصہ اسی پہ کیا ہے۔ اور اگر کیا ہے تو یقیناً وہ خود بھی بہت بے چین اور اذیت میں ہوں گی، آخر اس نے ان کا دل کیوں دکھایا۔؟ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہی سوچتے سوچتے وہ خود بھی بے چین اور مضطرب ہو گیا تھا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر وہاں سے نکل آیا۔ لمبے لمبے وگ بھرنا گاڑی تک آیا اور گاڑی نکل لے گیا!

✻ ✻ ✻

”مامہ! انہوں نے بالآخر اس کے قریب آکر اسے پکارا تو وہ چونک کر جیسے ہوش میں آئی تھی۔“

”جی۔۔۔ جی! کیا بات ہے؟“ وہ یکدم بستر پہ لیٹی
ان کی آواز سن کر اٹھ بیٹھی تھی۔

”کہاں کھوئی رہتی ہو“ میں آوازیں دے دے کر
تھک جاتی ہوں۔“ وہ خفگی سے بولیں۔

”کیس نہیں ملے! اس ایسے ہی کسی سوچ میں تھی شاید۔“ اس نے سر جھٹکتے ہوئے کہا اور وہ پٹہ اٹھا کر کندھوں پہ پھیلا لیا تھا۔

”ہر وقت کمرے میں کیوں بیٹھی رہتی ہو۔ ذرا سا کام کیا اور کمرے میں ذرا سا کام کیا، پھر کمرے میں یہ کیا سلسلہ بنا رکھا ہے تم نے۔ کل شیخ صاحب بھی یہی بات کہہ رہے تھے کہ مائدہ ہم لوگوں سے کچھنی کچھنی کیوں رہتی ہے؟“

”اماں! اس کے قریب اس کے بستے ہی بیٹھ گئی تھیں اور مائدہ کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں ہے اماں! کام ہی تو کر رہی ہوتی ہوں آپ کے سامنے۔“ اس نے ان کی بات ٹالی۔

”میں کاموں کی بات نہیں کر رہی، اکیلے بیٹھے رہنے کی بات کر رہی ہوں، ہمارے پاس بھی تو بیٹھ سکتی ہو، باتیں کر سکتی ہو، ہمیں بھی خوشی ہوگی یا پھر یہ کہ تم شیخ صاحب کو ابھی بھی غیر سمجھتی ہو، انہیں باپ نہیں سمجھتیں۔“

”اماں! آج اس کے پاس گلے شکوے لے کر آئی تھیں جن کو سن کے مائدہ کے دل پہ ہاتھ پڑا تھا۔ جی چاہا وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے اور اپنے اندر کا سارا غبار نکال دے لیکن اسے پتا تھا کہ اماں اس وقت شیخ صاحب کی منیت میں بول رہی ہیں اس لیے اس نے اگر کچھ بھی کہا تو انہیں ناگوار لگے گا لہذا وہ نہ چاہتے ہوئے جی خاموش رہی مگر اس کی روح کے آنسو اس کے دل پہ گرنے لگے۔

”اب کیا بات ہے چپ کیوں ہو گئی ہو؟“ انہوں نے اسے خاموش دیکھ کر دوبارہ متوجہ کیا۔

”کوئی نہیں اماں! اس ایسے ہی اتنے دنوں سے ایک بات سوچ رہی تھی مگر آپ میرا ساتھ دیں تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“

اس نے کہتے ہوئے بے ساختہ ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے تھے اماں نے اس کے انداز پہ چونک کر حیرت سے اسے دیکھا۔

”کیسی بات ہے؟“ وہ حیرانی سے پوچھ رہی تھیں۔

”اماں! پلیز! میری بات کا برا مت ماننا، مگر میں یہ رہ کر بول رہی ہوں، مجھے ڈپریشن ہونے لگا ہے، میں تھوڑا ناظم کمرے سے باہر گزارنا چاہتی ہوں۔ میں جاب کرنا چاہتی ہوں، آپ یہ مت سمجھیں کہ میں یہ جاب اپنی کوئی ضرورتیں یا خواہشیں پوری کرنے کے لیے گزارنا چاہتی ہوں میں خود اعتماد ہونا چاہتی ہوں، میرے اندر اعتماد کی کمی ہے، میں یہ کی دور کرنا چاہتی ہوں۔ اماں! میں دنیا کے قدم قدم سے ملا کر چلنا چاہتی ہوں، پلیز اماں! اگر میں اسی ایک چار دیواری میں رہی تو ایک روز میرا دم گھٹ جائے گا اور آپ کو اس کمرے میں میری لاش ملے گی۔ پلیز مجھے اجازت دے دیں۔ مجھے گھر کے سانس لینے دیں، مجھے جینے دیں پلیز۔“

اس نے روہانے کچھ میں کہتے ہوئے جیسے التجا کی تھی اور اماں اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئیں۔ وہ اس کی اس انوکھی فرمائش پہ حیران پریشان تھیں۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔؟“ وہ۔۔۔ پریشانی سے گویا ہوئی تھیں۔

”اماں! میں اپنی حالت اپنے دل کی بات اور کس سے کہوں گی سوائے آپ کے؟“ پلیز آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں، میرے پاس تعلیم ہے، عقل ہے، شعور ہے، مجھے اپنی عقل اور شعور کا استعمال کرنے دیں، پلیز اماں مجھے روکے مت۔“

”یہ اچانک بیٹھے بیٹھے کیا ہو گیا ہے تمہیں۔۔۔ یہ بھی کوئی تنگ ہے بھلا۔۔۔؟“ انہوں نے خفگی سے کہتے ہوئے اس کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ چھڑا لیے تھے۔

”اماں! یہ میں نے اچانک بیٹھے بیٹھے نہیں سوچا، بلکہ یہ سب سوچتے ہوئے تو مجھے مہینے ہو گئے ہیں بس میں ڈرتی تھی کہ آپ کو میری جاب کی فرمائش بری لگے گی لیکن آپ میری ماں ہیں، آپ میری خواہش پوری نہیں کریں گی تو اور کون کرے گا۔ آپ کی ایک بات میری بے سکون زندگی میں سکون بھر دے گی پلیز۔“

مائدہ اتنی جذباتی ہو رہی تھی کہ اس نے ماں کے

سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے اور اماں ششدر سی ہو کر دیکھنے لگیں۔

”دیکھو مائدہ! تم جانتی ہو کہ میں شیخ صاحب کو بتائے بغیر کوئی کام نہیں کرتی اس لیے وہ گھر آتے ہیں تو ان سے بات کرتی ہوں۔ وہ ماں گئے تو کر لیتا جاب، اگر نہ مائے تو خدمت کرتا۔ میں ان کے ساتھ بحث و تکرار نہیں کر سکتی۔“ وہ خفگی سے کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

”اماں! میں آپ کی بیٹی ہوں، شیخ صاحب کی نہیں۔ مجھے آپ نے اجازت دینی ہے اور مجھے آپ کی ہی اجازت کی ضرورت ہے، وہ اجازت دیں یا نہ دیں مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

مائدہ بالآخر کہہ ہی گئی تھی اور اماں یکدم پلٹ کے اسے تعجب بھری بے یقین نظروں سے دیکھنے لگیں

”آج وہ انہیں مسلسل حیران کر رہی تھی۔

”کیا کام نہ ہے۔؟“ ان کی حیرانی ان کے لبہ سے بھی جھلک رہی تھی۔

”کچھ غلط نہیں کہہ رہی۔ میں آپ کی بیٹی ہوں یہی حقیقت ہے میرے اچھے برے کا خیال آپ کو ہونا چاہیے شیخ صاحب کو نہیں آپ ان سے اجازت طلب نہیں کریں گی صرف یہ بتائیں گی کہ میں جاب کرنا چاہتی ہوں اور آج یا کل میں جاب کی تلاش شروع کر دوں گی۔“

”مائدہ! کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ کیسی عجیب باتیں کر رہی ہو۔ تم ہوش میں تو ہوتی۔۔۔؟“

”اماں! میں ہوش میں ہوں لیکن آپ نہیں ہوں۔ ہوان بیٹی کی ماں ہیں آپ لیکن پھر بھی بتاؤ ان ہیں۔ باقی ماؤں کی طرح آنکھیں اور کان کھلے رکھا کریں جو ان باتوں کی مائیں غافل نہیں رہتیں۔ ہر وقت چوکس اور چونکا رہتی ہیں سمجھ ہی نہیں رہیں، میں آخر ایسا کہوں کہ ساری حقیقتیں آپ پہ واضح ہو جائیں۔“

مائدہ کہتے کہتے بے بسی سے جھنجھلا گئی تھی۔

”تمہارا مطلب ہے کہ میں کم عقل ہوں، بتاؤ ان ہوں۔ تمہارا دھیان نہیں رکھتی؟“ انہیں اس کی

بات پہ اچنبھا ہوا تھا۔

”جی بالکل میں نے یہی کہا ہے۔“ اس نے سر ہلا کر اعتراض کیا تھا اور اماں لوگ رہ گئی تھیں۔

”مائدہ! تم اپنی ماں کو ایسا۔۔۔“

”آئی ایم سوری اماں! آپ کی کم عقلی اور بتاؤانی نے آج مجھے بولنے پہ مجبور کر دیا ہے ورنہ آپ خود عقل مند ہوتیں تو میرے کہنے پر ہر بات ہی سب کچھ سمجھ جاتیں، مجھے یہ نہ بتانا پڑا کہ اماں! زیادہ دیر گھر سے باہر مت رہا کریں مجھے ڈر لگتا ہے۔ اماں! رات کو نیند کی کوئی کھا کر نہ سویا کریں ورنہ مجھے نیند نہیں آتی آپ نیند کی کوئی کھا کے سوئی ہیں میری نیند اڑ جاتی ہے۔ ساری ساری رات جاگ کے گزار دیتی ہوں، کبھی نہادو کھو کر نئے کپڑے نہیں پہنتی، کچھ کچھ حکم آنسو پٹیوں اور میلے کپڑے چلے میں کیوں پھرتی ہوں؟ زیادہ جتنی نہیں ہوں زیادہ باتیں نہیں کرتی ہوں، کمرے سے باہر نہیں بیٹھتی ہوں، چپ رہتی ہوں، سوچ میں گم رہتی ہوں، آخر کیوں۔؟ کبھی جاننے کی زحمت کی آپ نے؟“

”کئی بار کمال اماں! میں صرف آپ کی بیٹی ہوں شیخ زمان کی نہیں۔ میری فکر میں آپ جاگا کریں، شیخ زمان کیوں جاگتا ہے بھلا۔۔۔؟“

وہ اماں کے کندھوں پہ دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے بولی اور یکدم پھٹ پڑی تھی اور حلیمہ بی بی کے قدموں تلے سے جیسے زمین سرک گئی تھی۔ ان کا وجود جیسے کسی نے دھجیوں میں اڑا دیا تھا۔ وہ مائدہ کو چٹنی چٹنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں اور مائدہ زیادہ دیر ان کے سامنے کھڑی نہ رہ سکی۔ وہاں سے نکل آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ اپنے آفس روم میں بیٹھا کچھ ضروری فائلز چیک کر رہا تھا جب اس کے کمرے کا دروازہ کھلا۔

”مے آئی کم ان سر۔۔۔؟“ اس نے حاسم کی آواز پہ چونک کے سر اٹھایا۔ وہ دروازے میں کھڑا اجازت طلب کر رہا تھا۔

”کم ان۔۔۔؟“ اس نے آہستگی سے سر ہلایا۔

”تھنک گا! اندر آنے کی اجازت تو ملی، ورنہ تمہاری شکل دیکھ کر تو بی لگ رہا تھا کہ تم منگ کر دو گے۔“
 حسام دروازے کا ہینڈل چھوڑ کے اندر آیا تھا۔
 ”کیا میرے منع کرنے سے تم واپس چلے جاتے؟“
 اقلن اپنے سامنے رکھی فائل کے بے ترتیب پرے پیچے زمین لگا۔
 ”بالکل نہیں“ حسام نے نفی میں گردن ہلائی اور اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔
 ”تو پھر میں تمہیں منع کیوں کرتا؟ جب تم نے میرے منع کرنے کے باوجود بھی واپس نہیں جانا تھا۔“
 اقلن نے کہتے ہوئے فائل ایک طرف رکھ دی۔
 ”دیکھ لو، مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔ تمہارے منع کرنے کے باوجود بھی تمہیں چھوڑ کے واپس نہیں جاتا۔“ حسام نے مسکرا کے کہا تھا لیکن اقلن افروز کے سرود ساٹ چہرے کے تاثرات اور بھی سر ہو گئے تھے۔ اس کے چہرے پر تناؤ آ گیا تھا۔
 ”محبت کا نام نہ لو افروز جی چاہے کہہ لو۔“ اس نے ساٹ سے لہجے میں کہا اور انٹر کا پی حسام کے لیے چائے آرڈر کی تھی۔
 ”یعنی کہ تمہاری ایک محبت کھوئی ہونے سے ہماری ساری محبتیں کھوئی ہو گئی ہیں۔ ہماری اپنائیت، ہمارا خلوص، ہماری چاہت سب بیکار ہے تمہاری نظر میں۔؟ تم نے ہماری محبت کو اس محبت سے مشروط کر دیا ہے جو تمہارے لیے کبھی تھی ہی نہیں، جس نے تمہیں دولت پر سے وار کے ایک سائیڈ پر رکھ دیا ہے۔“
 حسام کو اس کی بات بری لگی تھی اس لیے تھنی سے اسے حقیقت کا آئینہ دکھایا، جس پہ اقلن افروز بری طرح ہلایا اٹھا تھا۔
 ”بکو اس بند کروائی۔“
 ”بکو اس بند ہو سکتی ہے مگر حقیقت نہیں اور حقیقت یہی ہے کہ تم ابھی تک لکیر پیٹ رہے ہو، تم نے برباد کر لیا ہے خود کو۔“ حسام باز آنے والا نہیں تھا۔

”میں برباد ہوا ہوں ناں! آپ لوگوں کو کیا تکلیف ہے؟ کبھی تمہیں، کبھی واوی بی کو اور کبھی کسی اور کو۔“ وہ یکدم جھجھکا اٹھا اسے واوی بی کا صبح والا رویہ یاد آ گیا تھا۔
 ”مگر تمہیں یہ احساس ہو جائے ناں کہ ہمیں کیا تکلیف ہے تو تم یہ سوال ہی نہ کرو، مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ تمہیں احساس ہی نہیں ہے اور ہاں اس غلط فہمی میں مت رہنا کہ تمہاری بربادی یہ کسی اور کو بھی تکلیف ہوگی، ہونے! ایسا ہرگز نہیں ہے۔ تمہاری بربادی۔ اگر کسی کو تکلیف ہوتی ہے تو وہ صرف میں ہوں یا پھر واوی بی ہیں، کسی تیسرے کا سوچنا بھی مت۔!“
 حسام طنز پر اتر ہوا تھا اور اقلن افروز کا اس کی باتوں پہ خون کھول رہا تھا۔ اس موضوع پر آکر اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ لوگوں کی زبانیں کھینچ لے یا پھر ان کی گردنیں اڑا دے۔ اس معاملے میں وہ بہت بے رحم اور سفاک ہو جاتا تھا۔
 اقلن افروز کا سبیل فون بجنے لگا تھا۔
 ”ہیلو۔!“ آواز اور انداز ساٹ تھا۔
 ”صاحب! میں رشید بات کر رہا ہوں ہسپتال سے، بڑی بیکم صاحبہ کا ایک سیلنٹ ہو گیا ہے، بہت بری حالت ہے ان کی، آپ جلدی سے آجا میں صاحب۔“
 اقلن افروز کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی تھی اور یوں لگا کہ اس بلڈنگ کا لمبہ پورے کا پورا اس کے سر پہ آگرا ہو۔
 دونوں آگے پیچھے تیز رفتاری سے دھڑا دھڑ میڑھیاں اترتے تھے رنگ میں بیچتے تھے۔
 واوی بی کی تکلیف کا خیال ہی اس کے لیے سوہان روح ثابت ہو رہا تھا اور اس کے اپنے جسم سے جیسے جان نکلی جا رہی تھی۔ اور یہ سوچ الگ کچھ کے لگا رہی تھی کہ وہ ملت کے روئے سے ناراض تھیں اس سے، اگر ناراضی میں انہیں کچھ ہو جاتا تو۔؟ اقلن کا دل ڈوبنے لگا تھا۔

پورے چوبیس گھنٹے ہو گئے تھے اقلن اور حسام کو

آئی سی یو کے باہر انتظار کرتے ہوئے اس نے آئی سی یو میں داخل ہوتے ڈاکٹر اظفر کو بازو سے پکڑ کے روک لیا تھا۔
 ”دیکھیے ڈاکٹر! میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں میں اور زیادہ انتظار نہیں کر سکتا، مگر واوی بی کی حالت آپ لوگوں کے کنٹرول سے باہر ہے تو آپ مجھے ابھی بتا دیں میں انہیں کیسے اور شفٹ کر لیتا ہوں۔“
 ”مبارک ہو مسٹر اقلن! آپ کی واوی بی اب خطرے سے باہر ہیں۔“ وہ ڈاکٹر اظفر سے کچھ کہہ ہی رہا تھا کہ اسے میں آئی سی یو کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر رضوان نے آکر اسے واوی بی کی زندگی کی نوید سنائی تھی جس پہ ڈاکٹر اظفر بے ساختہ مسکرا دیے تھے اور اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔
 ”لیکن آئی ایم سوری! آپ کی واوی بی اب چل نہیں سکتیں، ان کی ٹانگیں بہت متاثر ہوئی ہیں۔“
 ڈاکٹر رضوان کی اگلی بات نے اقلن افروز کے اس پاس کئی دھماکے کر ڈالے تھے۔ وہ اک جھٹکے سے ان کی سمت پلٹا تھا۔
 ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“
 ”مسٹر اقلن! میں بہت افسوس ہے اس بات کا، لیکن ہمیں شکر ادا کرنا چاہیے کہ ان کی زندگی تو بچ گئی ہے نا، ورنہ ایسے شدید ایکسیڈنٹ کے بعد ان کے بچنے کی ہرگز امید نہیں تھی۔“
 وہ اسے سمجھا رہے تھے اور اقلن پچھنی پچھنی آنکھوں سے ان کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔
 ”اقلن بیٹھو یہاں۔“ حسام نے آگے بڑھ کے اسے بازو سے تھملا۔ لیکن اقلن ضبط نہ کر سکا۔ اس کے آنسو بہہ نکلے تھے۔ زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ رویا تھا۔

 ”میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتی تھی۔“ شیخ زبان کھانا کھا رہا تھا۔ جب حلیمہ بی بی چارپالی پہ ان کے قریب ہی آ بیٹھیں۔

”کو، کیا بات کرنی ہے۔؟“ وہ اجازت دیتے ہوئے بولے۔
 بچن کے دروازے سے لگی کھڑی ماندہ کا دل دھڑکنے لگا تھا، اسے پورا یقین تھا کہ شیخ زبان اس کی جاب کا سن کر پھر پورا مخالفت کریں گے۔
 ”میں کئی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ ماندہ پورا دن گھر میں اکیلی اور فارغ بیٹھی رہتی ہے اس لیے بہتر ہے کہ وہ بے کار بیٹھنے کے بجائے کوئی جاب کر لے، آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں۔؟“
 حلیمہ بی بی نے بات کرتے ہوئے اپنی نظریں پوری طرح سے شیخ زبان پر ہی جم رکھی تھیں۔ لہجہ بے حد مضبوط اور بے لگ تھا فیصلہ کن اور دو ٹوک۔
 ”کیا کہا۔؟“ شیخ زبان کا ہاتھ منہ میں نوالہ ڈالتے ہوئے وہیں کلوہیں ٹھہر گیا تھا ماندہ جاب کرے گی؟
 ”جی ہاں۔“
 ”کیوں؟“ شیخ زبان کے تیور بدل گئے تھے۔
 ”کیونکہ میں چاہتی ہوں وہ گھر پہ اکیلی اور فارغ نہ بیٹھے۔“ آج ان کا لہجہ اور آواز دبے دبے اور دھیمے سے نہیں تھے۔ وہ ایک ماں تھیں اور جب ایک ماں اپنے بچوں کے لیے اپنے موقف ڈٹ جائے تو اسے اس کے موقف سے ہٹانا دنیا کا مشکل ترین کام بن جاتا ہے۔
 ”کیوں؟ کیا اس جیسی وہ سری لڑکیاں گھروں میں اکیلی اور فارغ نہیں بیٹھی ہوتی۔ یا پھر یہ کہ وہ گھر سے باہر گھومنا پھرنا چاہتی ہے؟“
 شیخ زبان کو اپنا شکار ہاتھوں سے لکھا ہوا محسوس ہوا تھا ابھی تو وہ کھیا طنز پر اتر آئے تھے۔
 ”زبان سنبھال کے بات کر میں شیخ صاحب! آپ کی بیٹی ہے وہ۔“ حلیمہ بی بی نے بیٹی پر زور دیا۔
 ”میری بیٹی ہوتی تو مجھ سے پوچھ کے کام کرتی۔ دونوں ماں بیٹی نے اندر ہی اندر سب کچھ طے کر لیا اور مجھے اب بتا رہی ہو۔“
 انہوں نے غصے سے کہتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا ہوا نوالہ واپس ٹرے میں پھینک دیا تھا اور بچن میں کھڑی

مانندہ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا اسے پتا تھا کہ اب ضرور کوئی نہ کوئی ہنگامہ برپا ہوگا۔
 ”خود ار! کوئی نہیں کرے گی نوکری دو کرے“ اسے کو اوپچی ہواؤں میں اڑنے کے خواب چھوڑے اور گھر میں بیٹھے، یاہر نکلے گی تو لوگ سو سو باتیں بنائیں گے کہ شیخ زنان اپنی سوتیلی بیٹی کو ودقت کی روٹی بھی نہیں کھلا سکتا۔ کیا لوگوں کے سامنے میری ناک کٹوانا چاہتی ہو تم دونوں؟“ شیخ زنان آپے سے باہر ہو رہا تھا اور حلیمہ بی بی اس کے تاثرات ٹوٹ کر رہی تھیں۔

”جھا! آپ کی ناک کٹ رہی ہے اور جب حرا جاب کرتی تھی تب آپ کی ناک نہیں نکلتی تھی؟“ حلیمہ بی بی نے شیخ زنان کی بیٹی کا نام لیا جسے وہ ایک سال پہلے شادی کر کے رخصت کر چکا تھا۔
 ”وہ بچی تھی، تم عقل تھی نوکری کرنے کا شوق تھا اسے“ مجبوراً“ مجھے اس کی بات ماننا پڑی۔“ شیخ زنان نے ذرا سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔

”یہ بھی بچی ہے، تم عقل ہے اسے بھی شوق ہے اور مجبوراً“ مجھے اس کا شوق پورا کرنا ہی پڑے گا۔ آپ زیادہ پریشان نہ ہوں میں نے ماندہ سے کہہ دیا ہے وہ بس کچھ عرصہ ہی جاب کرے گی اور اس کے بعد میں اس کی شادی کروں گی، جیسے حرا اور فرح کی کی تھیں اچھے اور پڑھے لکھے گھرانوں میں۔“

حلیمہ بی بی نے شیخ زنان کو جتایا اور وہ لب بھینچ کے رہ گیا۔
 حلیمہ بی بی کہہ کے وہاں سے اٹھ گئی تھیں۔



”آخر آپ جا کہاں رہی تھیں؟“ اقلن افروز دکھ سے جھنجھلایا ہوا تھا۔
 ”عالیہ سے ملنے“ وہ پلکیں موندتے ہوئے آہستگی سے بولی تھیں اور اقلن نے چونک کر ان کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔
 ”عالیہ سے ملنے۔۔۔؟“

اقلن افروز کی آواز جیسے کسی کنویں سے سنائی دی تھی۔ ”ننگر کیوں؟“
 وادی بی بی کی بند پلکوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور اقلن ششدر سا ان کے بوڑھے اور جھریوں زدہ چہرے کی سمت دیکھ رہا تھا۔

”بھیک مانگتے جا رہی تھی تمہاری آزادی کی اس نے کہنا تھا کہ میرے پوتے کو مزید برباد نہ کرو۔ خود چلی گئی ہو تو اپنی یادیں بھی لے جاؤ، کیوں چھوڑ گئی ہو برباد کرنے کے لیے۔؟“ ماکہ وہ تمام عمر انہی یادوں میں تڑپ تڑپ کے جیتا رہے اور میں۔۔۔ میں اپنے پوتے کو دیکھ کر رزبئی رہوں۔ ہونہہ! امک۔ میں تو اس سے بھیک بھی نہیں مانگ سکی۔ میری ٹانگوں نے میرا ساتھ ہی نہیں دیا، مجھے راستے میں ہی روک لیا ہے، لیکن کوئی بات نہیں زندگی میں ایک بار اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کے اپنے پوتے کی آزادی ضرور مانگوں گی، چاہے وہ کہیں بھی ملے۔“ انہوں نے جیسے عہد کیا تھا۔

”نہیں وادی بی! ہرگز نہیں، آپ ایسا کچھ نہیں کریں گی جس سے میری شخصیت کا کوئی کمزور پہلو نظر آئے، میں اس کے حشر میں نہیں اس کے قہر میں قید ہوں۔ اس نے کیا سوچ کر میرے ساتھ بے وفائی کی۔؟ کیا میں کچھ بھی نہیں تھا۔؟ میں پاگل ہوتا ہوں تو صرف یہ سوچ سوچ کے کہ کیا اقلن افروز اتنا ارزاں تھا کہ وہ دولت کی چمک دمک میں اسے دیکھ ہی نہیں پائی۔۔۔ وہ دولت جسے محبت کرنے والے ہاتھوں کا میل کہہ کر ٹھکرا دیتے ہیں اور عالیہ نے اسی ہاتھوں کے میل کو سینے سے لگا لیا۔۔۔؟“

وہ اندر سے دکھی ہو رہا تھا، جب ہی تو وادی بی بی سے سب کہہ رہا تھا۔

”اگر وہ ہاتھوں کے میل کو سینے سے لگانے والی عورت تھی تو تم کیوں اسے سوچ سوچ کے اپنا خون جلاتے ہو۔؟“

”وہ ہاتھوں کا میل نہیں تھی وادی بی! وہ میری ذات پہ لگا ایک گمراہ عقیدہ تھی، وہ جب سے دور گئی ہے یہ دھبہ اور بھی نمایاں ہو گیا ہے اور میں اس دھبے کی وجہ

دہ پھپھاتا پھر رہا ہوں، میں نے اپنی ذات پہ خول ڈالیا ہے، ماکہ کسی کو کچھ نظر نہ آئے۔۔۔ اور اس کی کوشش میں اقلن افروز خود کہاں گم ہو گیا ہے، میں ہی نہیں جانتا۔“ اقلن افروز پشیمردہ سا وادی بی بی کے سامنے بیٹھا تھا۔



عصر کا وقت ہو رہا تھا اور حلیمہ بی بی اپنے گھر کے کمرے میں پریشان اور بے کل سی ٹہل رہی تھیں۔
 سارا درمیان ماندہ کی طرف لگا ہوا تھا وہ صبح نوبے گھر سے نکلی تھی اور اس وقت شام ہو رہی تھی بجائے اپنے گھر میں نوکری کی بھی یہی نہیں۔ اپنی عزت محفوظ رکھنے کی خاطر بجائے کہاں کہاں دھکے کھائی پھر رہی تھی ماکہ وہ شیخ زنان کے خوف سے بچی رہے اور اس کی گندی اور غلیظ نظروں سے اپنے آپ کو کچھ دیر دور رکھ لیا اور اس کوشش میں وہ صبح سے شام کچھ کی کچھ اور اسی تک گھر نہیں آئی تھی!

وہ برآمدے میں چھانک کر دیوار سے لگے کلاک سے ٹائم دیکھ رہی تھیں جب دروازے پہ اچانک دھک ہوئی تھی۔

لیکن سامنے ماندہ کے بجائے ان کی ایک جاننے والی کھڑی تھیں۔

”کیسی ہو حلیمہ! اندر نہیں آنے دو گی؟“ نسرین تپا اور حلیمہ بی بی کے آپس میں کافی اچھے تعلقات تھے وہ انوں ایک دوسرے کو کافی قریب سے جانتی تھیں اور ایک دوسرے کے حالات بھی سمجھتی تھیں۔

”ٹھیک ہوں آؤ اندر آؤ۔“ وہ سامنے سے ہٹ گئیں۔

”کیا بات ہے حلیمہ کچھ پریشان سی لگتی ہو؟“ نسرین تپا پہلی نظر میں ہی حلیمہ بی بی کے چہرے کی پریشانی کا پتہ چکی تھیں۔

”تم جھٹو تو سہی، میں پانی لے کر آتی ہوں۔“ حلیمہ بی بی انہیں چارپائی پہ بٹھا کر بلورچی خانے کی طرف لے گئیں۔

”ارے نہیں حلیمہ! پانی والی کی کوئی ضرورت نہیں ہے میں اقلن صاحب کے گھر سے ابھی پانی پی کر ہی آئی ہوں۔“ نیکر صاحبہ کا لہکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ جان تو بچ گئی لیکن جلتے پھرنے سے معذور ہو گئی ہیں، آج ہسپتال سے گھر آئی ہیں، میں نے سوچا میں بھی جا کر ان کی عیادت کر آؤں جتنا عرصہ ان کے گھر کام کیا، انہوں نے کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ مالک ہیں اور میں ملازم۔ انہوں نے بیش بہا برابری کا سلوک کیا ہے، اے! سامنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتی تھیں۔ آج ان کی تکلیف دہیمیں نہیں لگی، مجھ سے۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے اللہ اپنے بندوں کے کیسے کیسے امتحان لیتا ہے؟

”اوہ! انہوں نے گہری سانس کھینچی تھی۔ حلیمہ بی بی جانتی تھیں کہ نسرین نے اقلن صاحب کے گھر میں کافی عرصہ کام کیا ہے۔

”اب تم بتاؤ کہ تمہیں کیا ہوا ہے، تم کیوں پریشان ہو؟“ ان کی توجہ دوبارہ حلیمہ بی بی کی طرف مبذول ہو چکی تھی۔

”وہ میں دراصل ماندہ کے لیے پریشان تھی وہ صبح سے نوکری کی تلاش میں نکلی ہوئی ہے اور ابھی تک نہیں آئی۔“ انہوں نے بالاخر بتائی دیا تھا۔

”ماندہ نوکری کی تلاش میں۔۔۔؟“ نسرین تپا کو اچھنچا ہوا۔

”جی! وہ صبح سے شام تک گھر میں فارغ بیٹھی رہتی ہے جب تک حرا کی شادی نہیں ہوئی تھی تب تک تو ٹھیک تھی لیکن اب ایکلی اور فارغ رہ رہ کر آتا گئی ہے اس لیے میں نے کہا کہ وہ کہیں نوکری کر لے۔“ حلیمہ بی بی سب کو یہی بلور کر رہی تھیں کہ ماندہ کو جاب کرنے کے لیے انہوں نے خود کہا ہے۔

”ماندہ کے لیے جاب کے علاوہ بھی کچھ سوچا ہے یا نہیں؟“ نسرین تپا نے ان کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”تپا! اس وقت اصل مسئلہ اس کی جاب ہے اسے جاب مل جائے تو میں مطمئن ہو جاؤں گی اور سہولت سے اس کے لیے رشتہ تلاش کر سکوں گی بلکہ اس کام

میں آپ کو بھی میرا ساتھ دینا ہوگا۔

”ارے! ضرور ساتھ دوں گی تم اس کام میں ہاتھ تو ڈالو۔ جوان بیٹی کو کب تک گھر میں بٹھا کے رکھو گی؟“

نسرین کیا انہیں کافی اچھا اور مخلصانہ مشورہ دے رہی تھیں۔

”اسلام علیکم اللہ! اتنے میں کھلے دروازے سے مائدہ بھی اندر چلی آئی تھی، علیہ بی بی نے چونک کے اسے دیکھا۔

”ارے تم آگئیں؟ اتنی دیر کیوں لگا دی تھی۔ اب تو دل ہوئے لگا تھا۔“ علیہ بی بی فوراً اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھیں۔

”مجھے گھر سے باہر ڈر نہیں لگتا! مائدہ اپنی چادر اتارتے ہوئے بولی، پھر نسرین کو دیکھ کر انہیں سلام کرتے ہوئے ان کی سمت جھکی تھی انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔

”وعلیکم السلام! جیتی رہو، خوش رہو۔ کہیں نوکری ملی؟“ وہ نرمی سے پوچھ رہی تھیں۔

”ارے خالہ! آج کل نوکری کا ملنا بھی ایسے ہو گیا ہے جیسے کسی ڈوگری کا ملنا جس کے لیے چار چار سال محنت کرنا پڑتی ہے۔ صبح شام دھکے کھانا پڑتے ہیں۔ اپنا خون جلانا پڑتا ہے، بھوک اور دوسروں کی باتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں اور میرا تو ابھی پہلا دن ہے؟“ وہ مٹتی سے سر جھکتے ہوئے بولی تھی۔

”تم پریشان نہ ہو اللہ بستر کرے گا۔“ نسرین تپا کچھ سوچتے ہوئے اس کا سر تھیک کر کھڑی ہو گئیں، پھر دعا سلام کے بعد وہاں سے رخصت ہو گئیں۔ پیچھے وہ دونوں مل بیٹی سوچ میں کم اور پریشان بیٹھی تھیں۔

”عیशल! عیशल! اگلن! افروز! ڈانگ روم میں کھڑا عیशल کو آوازیں دے رہا تھا لیکن وہ نجانے کمال غائب ہو چکی تھی۔

”جج۔ جی صاحب جی۔“ وہ فوراً بھاگی بھاگی آئی تھی۔

”کہاں تھیں تم؟ تمہیں ہوا بھی ہے کہ میں آفس سے لیٹ ہو رہا ہوں اور تم نے ابھی تک ناشتہ بھی نہیں لگایا۔“ اگلن اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے عیशल پر غصہ نکل رہا تھا۔

”سوری صاحب جی! میں بیگم صاحبہ کو ناشتا کروا رہی تھی۔

میں نے سوچا آپ ابھی سو رہے ہیں اس لیے ناشتا ذرا لیٹ بناؤں گی۔

”اف! تم بھی کمال کی چیز ہو۔“ وہ اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے بریف کیس اٹھا کے باہر نکل گیا۔ اب یہاں کھڑے رہ کر ناشتا تیار ہونے کا انتظار کرنا فضول تھا۔ اسے ٹھیک دس بجے ایک میٹنگ کرنا تھی اس لیے تیز تیز قدم اٹھاتا اپنی گاڑی کی سمت بڑھ رہا تھا

جب نسرین تپا کی آواز پر اسے ٹھہرا دیا تھا۔

”سنئے صاحب جی۔“ وہ بھی تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی گاڑی کی دوسری طرف سے محوم کے اس کے سامنے آگئی تھیں۔

”جی کہتے۔“ وہ پیٹ کی جیب سے گاڑی کی چابی نکالتے ہوئے ان کی سمت متوجہ ہوا تھا۔

”وہ دراصل کل آپ اور حسام صاحب کسی لڑکی کے لیے بات کر رہے تھے جو بیگم صاحبہ کی دیکھ بھال کر سکے، ان کا خیال رکھے اور انہیں اچھی طرح سنبھال سکے۔“ نسرین تپا نے جلد جلد اپنی بات شروع کی۔

”اوہ اچھا! تو آپ کی نظر میں کوئی لڑکی ہے۔“

”جی ہاں صاحب! بہت اچھی لڑکی ہے جیسی آپ چاہتے ہیں ویسی ہی ہے اپنے کام سے کام رکھنے والی، سمجھ دار اور خاموش طبع ہے۔ نفاست پسند بھی ہے گھر کا ہر کام جانتی ہے۔“ نسرین تپا نے فوراً مائدہ کی خوبیاں بیان کی تھیں۔

”ہوں! ٹھیک ہے آپ اس لڑکی کو کل صبح سات بجے بھیج دیجئے گا میں اس سے مل لوں گا مناسب لگی تو نکل ہی اسے کام پر رکھ لوں گا۔“

”ٹھیک ہے صاحب! مہربانی آپ کی۔“ نسرین تپا سر ہلا کر سامنے سے ہٹ گئیں اور اگلن گاڑی نکل

لے گیا تھا اسے آفس پہنچنے کی جلدی تھی۔

شیخ زمان ناشتا کرنے کے بعد اپنی دکان پہ جانے کے لیے گھر سے نکلا تو مائدہ بھی جلالت سے گھر کے کام پٹا کر جاب کی تلاش میں نکلنے کے لیے تیار ہونے لگی۔

”ہاں! دوا کرنا مجھے آج کام مل جائے یوں جگہ جگہ دھکے کھانا بھی اچھا نہیں لگتا۔“ وہ اپنے ہاتھوں کو سلجھا کر کچھو میں جھرتے ہوئے بولی۔ دروازے میں کھڑی

علیہ بی بی اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

”ان شاء اللہ مل جائے گا کام۔“ انہیں اپنے رب پر پورا بھروسہ تھا اسی لیے یقین سے بولی تھیں۔ اتنے میں باہر کا دروازہ بجنے لگا۔

”یہ صبح کون آیا؟“ علیہ بی بی حیرانی سے کہتی ہوئی باہر آئیں اور دروازہ کھول دیا۔

”ارے نسرین۔“ انہیں نسرین کو دیکھ کر اور بھی حیرانی اور تعجب ہوا تھا۔

”اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو۔ کیا میں نہیں آ سکتی۔“

”ارے نہیں کیا! یہ بات نہیں ہے آپ اتنے اتنے دن اوھر کا چکر نہیں لگاتیں اس لیے کہہ رہی ہوں، کیونکہ ابھی کل شام کو ہی تو آپ آئی تھیں اور میں سوچ رہی تھی اب مہینے ڈیڑھ مہینے بعد ہی آپ کی شکل دیکھنا نصیب ہوگی۔“ وہ سامنے سے ہنستے ہوئے پولیس اور نسرین تپا اندر آ گئیں۔

”بس مائدہ کی وجہ سے کھینچی چلی آئی ہوں، کہاں ہے وہ۔“

”مائدہ کی وجہ سے۔“ کیا مطلب ہے آپ کا۔؟

خیر تو ہے؟“ علیہ بی بی اب تو ذرا سی بات پہ چونکی ہو جاتی تھیں۔

”جو میں نے پوچھا ہے وہ بتاؤ ناں۔“

”جی! وہ اندر تیار ہو رہی ہے۔“

”اچھا! مائدہ کو بلاؤ۔“ انہوں نے کہا اور برآمدے میں بیٹھے تخت پہ بیٹھ گئی تھیں۔

”مائدہ۔۔۔! انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے آواز دی تھی۔

”باہر آؤ تمہاری خالہ آئی ہیں۔ تم سے کوئی کام ہے شاید۔“

”جی ابھی آئی۔“ وہ اندر سے بولی۔

”اسلام علیکم خالہ! خیریت صبح کیسے رستہ بھول گئیں۔“ مائدہ نے بھی آتے ہی حیرانی ظاہر کی تھی۔

”ارے بچی! بیٹھے اوھر، کل شام سے ہی تمہارے کام کے لیے سوچ رہی تھی، پھر صبح ہوتے ہی تمہارے کام کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔“

”میرے کام کے لیے؟“

”ہاں! تمہارے کام کے لیے، اب تم بتاؤ کہ تمہارے لیے کام کرنا ضروری ہے یا پھر۔“

”میرے لیے کام کرنا ضروری ہے چاہے کام کوئی بھی ہو۔“ مائدہ درمیان میں ہی بول پڑی تھی۔ اس کا لہجہ اور انداز بے حد سنجیدہ تھا۔

”اگلن صاحب کی دادی لی کی دیکھ بھال کرو گی؟“ انہوں نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

”یہ کیا کام ہے؟“ مائدہ کوا چھبنا ہوا۔

”ارے بیٹا! ایسے کام ہزاروں مجبور اور ضرورت مند لڑکیاں کر رہی ہیں۔ اتنا بڑا گھر ہے ان کا، بیگم صاحبہ بالکل اکیلی ہوتی ہیں۔ اگلن صاحب صبح آفس کے لیے نکلتے ہیں اور شام کو واپس آتے ہیں بلکہ یوں کہو کہ رات کو واپس آتے ہیں۔ گھر میں چوکیدار، مالی،

ڈرائیور اور ایک ملازمہ بھی ہے لیکن وہ بے چاری اکیلی بیگم صاحبہ کو اور گھر کو نہیں سنبھال سکتی، اس لیے اگلن صاحب چاہتے ہیں کہ کوئی اچھی اور سمجھ دار لڑکی ملے تو وہ اسے بیگم صاحبہ کی دیکھ بھال اور تمام ذمہ داریاں سونپ کر دیں۔ وہ تو خود بڑی ہشاش بشاش اور چالاک و چوند خاتون تھیں لیکن اس نامراد ایکسیڈنٹ نے انہیں بستر سے لگا دیا ہے۔ بڑی

نفاست پسند طبیعت کی ہیں اسی لیے وہ چاہتے ہیں کہ کوئی سلیقہ مند لڑکی ملے اور تنخواہ بھی اچھی دیں

”گئے“

”تو کیا وہ مجھے کام پہ رکھ لیں گے؟“ مائدہ نے جیسے یقین چاہا۔

”ہاں کیوں نہیں رکھیں گے بھلا۔ میں ابھی ان ہی سے بات کر کے آئی ہوں وہ اس کے لیے نکل رہے تھے میں نے تمہارے لیے بات کی تو کہنے لگے کہ کل صبح سات بجے پہنچ رہا تھا تم جا کر ان سے مل لینا اور ساتھ میں یہ بھی بتا دینا کہ میں نے تمہیں بھیجا ہے۔“ انہوں نے مائدہ کو تفصیل سے سمجھایا۔

”سچ خالہ! مجھے کام مل جائے گا ناں؟“

مائدہ نے ان کے ہاتھ تھام لیے تھے۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا کہ وہ اس گھری چار دیواری سے چند گھنٹوں کے لیے آزاد ہو رہی ہے اس کا مقصد یہاں سے نکلنا تھا ورنہ اسے کام سے تو کوئی غرض نہیں تھی۔ شیخ زہان کی نظروں سے چھپنا چاہتی تھی مگر یوں بھی اس کی تعلیم زیادہ تھی۔ اسے کسی بڑے دفتر میں مشکل سے ہی ملازمت ملتی۔

”ہاں ہاں! مل جائے گا ناں!“ انہوں نے اشدت میں سر ہلایا تھا اور مائدہ بے ساختہ ان کے گلے لگ گئی تھی۔

وہ صبح فجر کے وقت بیدار ہوئی وضو کر کے نماز پڑھنے کھڑی ہوئی۔ وہ نماز پڑھ کے دعا مانگ رہی تھی جب اس کے کمرے کا دروازہ ہلکی سی آہٹ سے کھلا اور بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ مائدہ نے اپنی بند آنکھیں کھولتے ہوئے یکدم گردن موڑ کے اپنے پیچھے دیکھا تو ایک سنسنی سی پورے جسم میں سرایت کر گئی اس کے لب دعا کرنا بھول گئے وہ شیطان اس کے قریب آچکا تھا۔

”اے!“ تکلف کے مارے اس کے منہ سے ایک شدید قسم کی آہ نکلی تھی اسے جائے نماز سے ہاتھوں سے پکڑے اٹھایا اور اسے خونخوار نظروں سے دیکھا۔ ”تم کیا سمجھتی ہو کہ اس طرح نوکری کر کے اور گھر

سے باہر رہ کر تم مجھ سے بچ جاؤ گی یا پھر وہ تمہاری بے وقوفی ماں تمہیں مجھ سے بچالے گی۔؟ ہونہ! بھول ہے تم دونوں میں بیٹی کی تمہارے لڑکھن سے لے کر تمہاری بھولی تک تم میرا جتنا بھی خرچ ہوا ہے، وہ ایک بار تم سے وصول کر کے ہی رہوں گا۔ بس انتظار کرو کہ یہ ہوا تک ہے۔؟ اور ہاں اب اگر اپنی ماں کو کچھ بتایا تو یاد رکھنا کھڑے کھڑے اسے طلاق دے کر گھر سے باہر کر دوں گا میں اگر اسے برداشت کر رہا ہوں تو صرف تمہاری وجہ سے۔ نوکری کرو، بے شک کرو، لیکن مجھ سے بچنے کے خواب مت دیکھو، ورنہ آنکھیں نکل دوں گا۔ سمجھیں تم۔؟“

اس نے اک جھٹکے سے اس کے بال چھوڑے۔ وہ کافی غیر متوازن قدموں پہ کھڑی تھی سیدھی جائے نماز پہ عین سجدے کی جگہ جا کر رہی تھی اس کا سر زور سے زمین سے ٹکرایا اور وہ چکرا گئی۔ اس نے اپنے چکراتے ہوئے سر کو تھما دیا وہیں جائے نماز پہ بیٹھی اپنے گھٹنوں میں منہ دیے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی۔

”اے اللہ! اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو گی یا تو مجھے معاف فرما دے۔ مجھے اس شیطان سے بچالے اے اللہ! میری عزت و ناموس کی حفاظت تیرے ذمے ہے۔ میرا دامن دل سے بچانا بے شک تو اپنے بندوں کو ان کی برداشت سے زیادہ نہیں آزاتا۔“

وہ گھٹنوں میں منہ چھپائے کافی بلند آواز میں روئے ہوئے اپنے رب کے آگے فریاد کر رہی تھی اور شیخ زہان جیسا شیطان یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ وقت قبولیت کا وقت ہوتا ہے۔!

”کیا بات ہے مائدہ تم روتی رہی ہو؟“ حلیمہ بی بی اس کی سوئی ہوئی متورم آنکھیں دیکھتے ہی بھانپ گئیں کہ وہ روئی ہے۔ ”میں۔۔۔ اس نے سختی سے انکار کر دیا۔

”تو پھر تمہاری آنکھیں اور چراگے؟“ ”آپ مجھے لیٹ نہ کریں، جلدی سے ناشتا دس، مجھے نکلنا بھی ہے۔“ وہ ناظم دیکھتے ہوئے غلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی تھی۔ ”اکیلی چلی جاؤ گی اکلن صاحب کے گھر۔؟“ ”ظاہر ہے عہد میں نے اکیلے کرتا ہے تو میں نے اکیلے ہی جانا ہے نا۔“ وہ لاپرواہی سے کہتی ہوئی ان کی بات ٹال گئی تھی۔

اس نے جلدی جلدی دو چار تھکے زہر مار کیے اور حلیمہ بی بی کو اللہ حافظ کہتے ہوئے باہر نکل آئی۔ شیخ زہان اس کو سولی پر لٹا کر مزے سے سوراہا تھا۔

مائدہ اس گھر کے وسیع و عریض احاطے کو حیران اور مرعوب نظروں سے دیکھتی ہوئی گیٹ کے قریب آئی تھی اور تیل بجا دی۔ اگلے پانچ سیکنڈ میں اندر سے چوکیدار نمودار ہو گیا۔

”جی فرمائیے کس سے ملنا ہے؟“ ”جی وہ۔۔۔ اکلن افروز صاحب سے ملنا ہے۔“ مائدہ نے اپنا اعتماد بحال رکھنے کی کوشش کی۔

”کس سلسلے میں ملنا ہے آپ نے؟“ چوکیدار پوری معلومات چاہ رہا تھا۔ ”وہ دراصل انہیں بیگم صاحبہ کے لیے کسی۔“ ”اوہ اچھا اچھا! میں سمجھ گیا آپ نسرین آپا کی طرف سے آئی ہیں؟“ چوکیدار کو بھی شاید پہلے سے پتا تھا۔ ”جی! مجھے نسرین خالہ نے ہی بھیجا ہے۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”آئیے! اندر آجائیے صاحب بھی آپ کا انتظار کر رہے تھے۔“ چوکیدار اسے اندر آنے کے لیے راستہ دیتے ہوئے خود پیچھے ہٹ گیا۔ وہ اندر آئی اور چوکیدار کی سمیت میں چلتی ہوئی اندر پہنچی اس آدمی کو دیکھتی رہ گئی تو لہجہ سے بل کر ماما ہوا انہی کی سمت پلٹا تھا۔

”صاحب! چوکیدار نے کالی دھچھے اور مٹو ب لہجے میں پکارا تھا۔ اکلن نے تو لیے والا ہاتھ روکتے ہوئے

چوکیدار کی سمت دیکھا لیکن اس کے ساتھ ایک اجنبی لڑکی کود کچھ کر چوٹک گیا۔ ”صاحب! نسرین آپا نے بیگم صاحبہ کے لیے بھیجا ہے انہیں۔“ چوکیدار نے تعارف کرایا۔ ”اوہ اچھا! ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ انہیں۔ میں دس منٹ میں آ رہا ہوں۔“

اکلن کالب و لہجہ بنا تلا تھا۔ اس نے نیپل پہ رکھا جو اس کا گلاس اٹھانے منہ سے لگا لیا۔ مائدہ اکلن افروز کو دیکھتی ہوئی چوکیدار کے ساتھ واپس پلٹ گئی وہ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلا گیا۔ وہ ڈرائنگ روم کا جائزہ لے رہی تھی اکلن افروز نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہوئے گلا کھنکار کے اسے متوجہ کیا تو وہ یکدم کڑیٹا کے صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”السلام علیکم۔!“ اسے اچانک سلام کرنے کا خیال آیا تھا۔

”وعلیکم السلام! بیٹھے۔!“ اکلن نے اسے دوبارہ بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اس کے مقابل والے صوفے پہ بیٹھ گیا۔ ”کیا نام ہے آپ کا؟“ ”مائدہ امین!“

”آپ کو پتا ہے کہ آپ کو یہاں کس کام کے لیے بھیجا گیا ہے؟“

”جی! بڑی بیگم صاحبہ کی دیکھ بھال کے لیے۔“ اس نے آہستگی سے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”تو کیا آپ وادی بی بی کی دیکھ بھال کر سکیں گی؟“ وہ اپنے مطلب کے دو ٹوک سوال پوچھ رہا تھا۔ ”جی کیوں نہیں۔۔۔ اسی لیے تو آئی ہوں۔“ مائدہ کا رفتہ رفتہ اعتماد بحال ہو رہا تھا۔

”آپ جانتی ہیں کسی کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اٹھانا آسان کام نہیں ہے؟“ ”کسی کو اپنا سمجھ کر یہ ذمہ داری اٹھالیں تو ذرا بھی مشکل نہیں لگتی، لیکن اگر محض کام سمجھ کر یہ ذمہ داری نبھائی جائے تو واقعی بہت مشکل لگتی ہے۔“ مائدہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا تھا۔

”تو آپ کیا سمجھ کر یہ ذمہ داری نبھائیں گی؟“
 اقلن نے ماندہ کے چہرے کی سمت دیکھتے ہوئے پوچھا
 تھا نظرس کالی گہری تھیں۔
 ”میں ان کو اپنا سمجھ کر ذمہ داری نبھاؤں گی۔“
 ”کیوں؟ آپ کا ان کے ساتھ ایسا کیا ریلینش ہے
 کہ آپ انہیں اپنا سمجھ کر ذمہ داری نبھائیں گی؟“
 اقلن کا لہجہ اور انداز ٹھیکھا ہو گیا تھا۔
 ”دیکھیے سر! میرا۔ انسانیت کا رشتہ ہے، آپ
 مجھے تنخواہ گئے نام پر کچھ بھی نہ دس میں تب بھی ان کی
 دیکھ بھال کے لیے آسکتی ہوں، کیونکہ وہ اس وقت بے
 بی اور معذوری کے دور سے گزر رہی ہیں۔ انہیں
 کسی انسان کے سہارے کی ضرورت ہے اور مجھے
 خوشی ہے کہ ان کی خدمت کے لیے اللہ نے مجھے
 منتخب کیا ہے، مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔“
 ”حیرت ہو رہی ہے آپ کی بات پر؟“ اقلن نے اپنی
 حیرت کا برملا اظہار کیا تھا۔
 ”حیرت کس بات پر ہے آپ کو؟“
 ”آپ کے انسانیت بھرے پیکچر پر، کیونکہ عورت
 اپنے مفاد کے بغیر کبھی کوئی کام نہیں کرتی۔“ اقلن کا
 لہجہ سرد ہو گیا تھا۔
 ”آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ اپنے مفاد کے بغیر تو
 کوئی بھی انسان کام نہیں کرتا، صرف عورت پر ہی
 الزام کیوں رکھ رہے ہیں آپ؟“
 ”کیونکہ عورت کو مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔“
 اقلن افروز یکدم اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے چہا کر بولا
 تھا۔
 ”اور مگر کتنا مفاد پرست ہے یہ مجھ سے بہتر کوئی
 نہیں جانتا۔“
 ماندہ بھی اپنے اندر کی تلخی چھپا نہیں پائی تھی۔ اس
 کا جی چاہا ایک بل میں اقلن افروز پر مدتی مروا لگی اور
 کر تو توں کے قصے واضح کر کے رکھ دے لیکن وہ کام کے
 لیے آئی تھی۔ اسی لیے چپ ہو رہی تھی۔ اور
 خاموشی تو دوسری طرف بھی چھائی ہوئی تھی وہ لب
 بچنے بجائے کیا سوچ رہا تھا۔

”دیکھیے سر! آپ نے جو کہا ہے کہہ دیجئے ورنہ
 مجھے اجازت دیں۔“
 وہ اپنا بیگ اٹھاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی لیکن
 اقلن افروز اب اتنا بھی مشتعل نہیں ہوا تھا کہ جس
 سے کام تھا اسے ہی نکال دیتا۔
 ”ٹھہریے مس ماندہ امین!“ اس نے ماندہ کے
 بڑھتے ہوئے قدموں کو روک دیا تھا اور خود صوفے سے
 اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا۔
 ”آپ آج سے ہی اپنا کام جوائن کر سکتی ہیں اور
 ہاں آپ نے تنخواہ کتنی لیتی ہے یہ بھی بتا دیجئے گا۔“ وہ
 کہہ کے وہاں رکنا نہیں بلکہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا
 باہر نکل گیا۔ ماندہ کو اقلن افروز کی عجیب سی شخصیت
 پر حیرت ہو رہی تھی۔ اس نے تو خالہ نسرین سے بہت
 تعریفیں سنی تھیں اس کی، اور وہ تو پہلی ملاقات میں ہی
 کٹ کھانے کو ڈر رہا تھا۔ اس کا عجیب و غریب رویہ
 اسے حیرت میں ڈال رہا تھا۔



داوی بی اور ماندہ کی اندر اسٹینڈنگ ایسی ہوئی کہ وہ
 دونوں ہی اپنے اپنے غم بھول گئیں اور اک دوسرے کو
 سمجھنے کی کوشش میں لگن ہو گئیں۔ داوی بی کو ماندہ کی
 صورت میں ایک سادھی اور غم خوار مل گیا تھا وہ دن بھر
 ان کے ساتھ رہتی ان کی باتیں سنتے ہوئے کام پٹائی
 رہتی تھی اور شام ڈھلے جب وہ واپسی کے لیے
 رخصت ہوتی تو وہ دونوں ہی اداس ہو جاتی تھیں۔
 ماندہ کا گھر واپس جانے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔
 اسے پتا تھا کہ وہ واپس جانے کی تو شیخ زمان کی غلیظ
 نظروں سے سامنا ہو گا اسی لیے وہ اکثر اپنے نام سے
 بھی لیٹ ہو جاتی تھی۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ماندہ کا
 چہرے آف ہو چکا تھا لیکن وہ پھر بھی جانے کے لیے
 تیار نظر نہیں آرہی تھی۔ داوی بی کو وضو کروا کے وہ خود
 وضو کرنے چلی گئی، پھر واپس آ کر اس نے بھی نماز کی
 نیت باندھ لی تھی۔
 ”السلام علیکم داوی بی!“

اقلن داوی بی کے ہنر روم کا دروازہ کھول کے
 اچانک اندر داخل ہوا تھا لیکن جیسے ہی داوی بی کے ہنر
 کے قریب نظر پڑی۔ اس کے قدم اور الفاظ وہیں ٹھہر
 گئے تھے۔
 ”وعلیک السلام! آؤ بیٹھو۔“ داوی بی سلام پھیر
 چکی تھیں اور بیچ پر ڈھ رہی تھیں اقلن کو دیکھتے ہی
 فوراً ”بول پڑی تھیں۔“
 ”ہوں! ایسی ہیں آپ۔“ وہ دھجے اور بھاری
 قدموں سے چلتا ہوا ان کے قریب آ گیا تھا۔
 ”کیا سوچ رہے ہو؟“ داوی بی نے حیرت سے کہتے
 ہوئے اسے متوجہ کیا تھا اور اقلن بری طرح چونک
 اٹھا۔ ماندہ سلام پھیر چکی تھی اور اب دونوں ہاتھ اٹھا کر
 دعا مانگ رہی تھی۔
 ”کچھ نہیں! میں صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ مس
 ماندہ امین اپنے وقت سے کوحا خشنہ لیٹ ہو چکی ہیں،
 انہوں نے گھر نہیں جانا؟“ اقلن کو بھی اس کے لیٹ
 ہونے کا احساس ہو چکا تھا اسی لیے گھڑی سمت دیکھا
 تھا۔
 ”ارے بیٹا! ماندہ تو اکثر ہی لیٹ ہو جاتی ہے۔
 مغرب کی نماز میرے ساتھ پڑھ کے گھر واپس جاتی
 ہے۔“
 ”اچھا؟“ اسے اچھپا ہوا تھا۔
 ”ٹھیک ہے داوی بی! میں اب چلتی ہوں۔“ وہ
 جائے نماز سمیٹ کر چادر اوڑھتی ہوئی ان کے پاس آ
 گئی تھی۔
 ”ارے بیٹا! تھوڑی دیر اور ٹھہر جائیں ہمارے
 ساتھ کھانا کھائیں۔“
 ”نہیں داوی بی! کھانا میں اماں کے ساتھ جا کر
 کھاؤں گی۔ وہ میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ آپ مجھے
 اجازت دیجئے میں چلتی ہوں۔“ اس نے انکار کر دیا
 تھا۔
 ”ڈرائیور سے کہو کہ تمہیں چھوڑ آتا ہے۔ شام
 کالی گہری ہو چکی ہے۔“ ”نہیں داوی بی! میں چلی
 جاؤں گی مہربانی آپ کی۔“ ماندہ نے ان کے قریب

بیٹھے اقلن کو دیکھتے ہوئے انکار کر دیا تھا۔ وہ چپ چاپ
 ان دونوں کی گفتگو اور اپنائیت بھرے لہجے سن رہا تھا۔
 ”نہیں بیٹا! شہر کے حالات تو ویسے ہی بہت خراب
 ہیں جو ان لڑکیوں کا اس وقت اکیلے باہر نکلنا ٹھیک نہیں
 ہے۔ اقلن انھوں بیٹا! رشید سے کہو ماندہ کو اس کے گھر
 ڈراپ کر آئے۔“ انہوں نے اقلن کو مخاطب کرتے
 ہوئے کہا۔
 ”رشید گھر پر نہیں ہے۔“ اقلن نے لٹھ مار سا
 جواب دیا۔
 ”کیوں کہاں ہے وہ؟“
 ”عیشیل کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گیا ہوا ہے اس کی
 طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ اقلن کو اب داوی بی کے
 سوال و جواب پر اچھن ہونے لگی تھی۔
 ”دیکھو بیٹا! وہ اکیلی اس وقت کیسے جائے۔ جو ان
 جہان لڑکی ہے کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ ایسا کرو تم اسے
 ڈراپ کرو، بس پانچ دس منٹ کا راستہ ہے، ذرا سی
 زحمت کرو۔“
 داوی بی نے ڈرائیور کا کام اقلن کے کندھوں پر
 ڈال دیا۔ لیکن وہ اتنی موت بھانے والا نہیں تھا۔
 ”آئی ایم سوری یہ کام میرا نہیں ہے۔“
 وہ کہہ کے وہاں سے اٹھ گیا تھا اور داوی بی اور ماندہ
 دیکھتی رہ گئیں۔ داوی بی کو اس سے ایسی بے موتی کی
 ہرگز امید نہیں تھی سنا ماندہ کو پتا تھا کہ داوی بی کو اقلن
 افروز کے رویے پر شرمندگی ہوئی ہے اسی لیے وہ
 انہیں شرمندگی کے احساس سے نکلانے کے لیے کافی
 نارمل اور لاپرواہ سے انداز میں مخاطب ہوئی تھی۔
 ”اقلن صاحب ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں داوی بی!
 ڈرائیور ہوتا تو اور بات تھی۔ اب وہ کہاں مجھے ڈراپ
 کرنے کے لیے جائے۔؟ انہیں تنگ کرنے سے
 بہتر ہے میں خود ہی چلی جاؤں، وہ بھی تو آفس سے تھکے
 ہوئے آئے ہیں۔“
 ”لیکن ماندہ اس نے۔“
 ”ڈونٹ وری داوی بی۔! انہوں نے ایسا کچھ بھی
 نہیں کہا جو مجھے یا آپ کو برا لگے۔ محکم کے باعث

بندے کا مزاج ایسا ہو ہی جاتا ہے، میں آسانی سے گھر چلی جاؤں گی آپ فکر نہ کریں۔ اپنا خیال رکھیے گا“
اللہ حافظ۔

وہ انہیں سمجھا کر تسلی دیتی ہوئی باہر نکل آئی تھی لیکن باہر آکر اس کے قدم سست پڑ گئے تھے اور اس کے قدموں کی سستی ٹیس میں کھڑے اقلن افروز سے چھپی ہوئی نہیں رہ سکی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ یہاں سے جایا نہیں چاہتی تھی لیکن کسی مجبوری کی وجہ سے جاری تھی۔ اس نے دوبار گھر کر پلٹ کر اس گھر کو دیکھا۔ اور بڑی حسرت بھری نظروں سے دیکھا پھر آگے بڑھ کر دروازہ عبور کر گئی۔ اقلن افروز کو اس کا انداز سمجھ میں نہیں آیا تھا وہ الجھ سا گیا تھا۔!



اندھیرے کے باوجود سڑک الیکٹرک پول اور گاڑیوں کی روشنیوں میں جگہ رہی تھی مائدہ پیدل چلتی ہوئی رہا نہ اس پر اسے نکل کر فٹ پاتھ پہ آئی تھی۔ اس کے قدم اب بھی ست روی سے اٹھ رہے تھے۔ اس کا دل چاہتا تھا وہ دن رات گھر سے باہر رہے ماکہ ایک مل کے لیے بھی شیخ زنان کی نظروں کا سامنا نہ ہو۔ لیکن لاکھ کوششوں کے باوجود بھی ایسا ہوتا نہیں تھا۔ وہ شیطان تو جیسے دروازے پہ ہی نظر نہ جمائے بیٹھا ہوتا تھا۔ مائدہ وہ اپنے وحیان میں گم چلی جا رہی تھی جب اسے لگا جیسے کہ شیخ زنان نے اسے پکارا ہے۔ اس نے اپنا وہم سمجھ کر سر جھٹک دیا تھا۔

”مائدہ! گاڑی میں بیٹھو“ میں تمہیں ہی لینے کے لیے آیا ہوں۔“ دوبارہ شیخ زنان کی آواز سنائی دی تو اس نے یکدم کرنٹ کھا کے دیکھا تھا۔ شیخ زنان پر اسے ناؤں کی اپنی پلٹھری گاڑی میں بیٹھا اسے مخاطب کرتے ہوئے بیٹھے کا اشارہ کر رہا تھا۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ مائدہ اس کے ساتھ اکیلی گاڑی میں بیٹھ جاتی۔ اسے تو سوچ کے ہی جھرجھری سی آئی تھی۔

”میں چلی جاؤں گی۔“

”مجھے پتا ہے چلی جاؤ گی لیکن میرے ساتھ جانے“

میں کیا حرج ہے۔“

”میں نے کہا تھا چلی جاؤں گی خود۔“ مائدہ چبا کر بولی تھی۔

”بہت پر نکل آئے ہیں تم دونوں ماں بیٹی کے کٹ کے رکھ دوں گا۔ آرام سے گاڑی میں بیٹھو۔ تمہاری بکواس سننے نہیں آیا۔ تمہاری ماں نے بھیجا ہے مجھے۔“

شیخ زنان گاڑی سے نکل آیا اور مائدہ گھبرا گئی کہ اس پاس کے لوگ کیا سوچیں گے۔ یہاں کوئی تماشا نہ بن جائے۔

”آپ کو میری ماں بھیجے یا میرا باپ؟ میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔“ اس نے نفرت سے کہتے ہوئے منہ پھیر لیا تھا۔

”تمہارا تو باپ بھی جائے گا۔ کیسے نہیں جانتی تم شیخ زنان نے غصے سے مشتعل ہوتے ہوئے مائدہ کی کٹائی دیوچ کر اسے گاڑی کی سمت کھینچا تھا اور پھر مائدہ کی برداشت جواب دے گئی۔ اس نے شیخ زنان کے پس پہ پاگل ہوتے ہوئے ایک زنانے وار پھینچ کر اس کے منہ پر دے مارا۔ اور اس سے پہلے کہ شیخ زنان غیض و غضب میں آکر جواباً کوئی کاروائی کرنا مائدہ اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا کر یکدم بھاگ کھڑی ہوئی۔ اور ایسی اندھا دھند بھاگی کہ اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ اور یوں ہی بھاگتے بھاگتے اسے ہوش اس وقت آیا جب وہ اپنے گھر کے سامنے پہنچ گئی تھی۔ اس نے دروازہ دھڑا دھڑ پٹ ڈالا۔

”اماں دروازہ کھولو۔“ اس کی آواز ہانپ رہی تھی اور سانس پھولی ہوئی تھی۔

”اماں۔“ اس نے دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا تھا۔

”اللہ خیر کرے کیا ہو گیا ہے بھئی؟“ حلیمہ بی بی نے دروازہ کھولتے ہوئے دل کے کما تھا اور مائدہ نے اندر داخل ہو کر اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا تھا۔

”ارے کیا ہو گیا ہے بیٹا مجھے کچھ بتاؤ تو سہی۔؟“

حلیمہ بی بی بھی گھبرا گئی تھیں۔

”اماں! وہ وہ شیخ زنان۔ وہ میں نے اسے۔“ مائدہ کی سانس پھولی ہونے کی وجہ سے بات بھی بدل رہی تھی۔

”کیا ہوا ہے شیخ صاحب کو۔؟“ حلیمہ بی بی الجھ گئیں۔

”اماں! وہ مجھے گاڑی میں۔“ مائدہ وہیں دروازے کے قریب ہی ڈھے گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

حلیمہ بی بی کے گھبراہٹ کے مارے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے۔ وہ بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی تھیں۔

”مائدہ! بتاؤ ناں کیا ہوا ہے؟ میرا دل گھبرا رہا ہے؟“

”اماں! میں نے انہیں پھینچ مار دیا ہے۔ وہ وہ زہرستی مجھے گاڑی میں بٹھا رہے تھے، میں نے انکار کر دیا تو میری کٹائی پکڑ کر کھینچنے لگے مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ میں کیا کروں۔ اس لیے غصے میں۔“

وہ کہتے ہوئے رو پڑی اور حلیمہ بی بی ساکت بیٹھی رہ گئیں۔ ان کا دل غم سے ہو چکا تھا۔ انہیں اپنی زندگی اور اپنی بیٹی کی عزت خطرے میں نظر آ رہی تھیں اور بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں تھا۔!

”لگتا ہے تم ساری رات سوئی نہیں ہو یا پھر روٹی رہی ہو۔“ وہ داوی بی کی کو اخبار سنانے کے لیے بیٹھی تو داوی بی نے اچانک سوال دل دیا تھا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے داوی بی! آپ نیند سوئیں۔“ مائدہ کی آواز کٹانی پو جمل ہو رہی تھی۔

”نہیں! مجھے وہ نیند سناؤ جو تمہارا چہرہ اور تمہاری آنکھیں سن رہی ہیں۔“ داوی بی اپنی بات پہ جم چکی تھیں۔

”میرے پاس کچھ اچھا نہیں ہے سنانے کے لیے۔“ مائدہ کا سر جھٹک گیا تھا۔

”اچھا تو اس اخبار میں بھی نہیں ہے جو تم مجھے

سنانے کے لیے بیٹھی ہو۔“

”ہاں تو یہی سمجھ لیں کہ میری نیند آپ کو اس اخبار کی کسی سرخی سے ہی مل جائے گی روز کسی نہ کسی لڑکی کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے، کسی لڑکی کے ساتھ بہنوئی زیادتی کر دیتا ہے، کسی لڑکی سے سوتیلے باپ کی بری نظر ہوتی ہے، کوئی انتہائی زیادتی کا شکار ہو جاتی ہے کسی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور کسی کو۔۔“

”مائدہ۔۔؟“ داوی بی اسے درمیان میں ہی روک چکی تھیں وہ بلا کی ذہین تھیں انہیں نیند سمجھ آچکی تھی۔

”داوی بی سب کچھ سمجھ چکی تھیں۔ مائدہ ان کے قدموں میں آ بیٹھی تھی اور ان کے کھننے پر سر رکھ کے تڑپ تڑپ گئی تھی۔

”میرے اماں! انہوں نے اپنی پسند سے شادی کی تھی اس لیے خاندان میں کسی نے بھی ان کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ دونوں اکیلے رہتے تھے لیکن میری پیدائش کے آٹھ سال بعد اپنی وفات ہو گئی اور اماں اکیلی رہ گئیں دو تین سال وہ دھڑا دھڑ کر کے مکانوں میں دوڑنے لگتی رہیں لیکن ایک بیٹی کے ساتھ وہ کب تک خوار ہو سکتی تھیں؟ میں کسی کے سارے اور سر پہ چھت کی ضرورت تھی اس لیے انہوں نے اپنے آپ کو اور اپنی بیٹی کو محفوظ رکھنے کے لیے شیخ زنان سے شادی کر لی۔ شیخ زنان کی اپنی بھی دو بیٹیاں تھیں جنہیں اماں نے ہمیشہ مجھ سے بھی زیادہ چار دیا۔ جب تک وہ رہیں سب ٹھیک تھا، جیسے ہی ان کی شادیوں ہوئیں شیخ زنان کی نظرس غلیظ سے غلیظ تر ہوتی گئیں۔ راتوں کو اماں دوا کھا کر سو رہی ہوتیں تو شیخ زنان میرے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوششوں میں لگ جاتا۔ اماں گھر سے باہر نکلتیں تو وہ تھمائی ڈھونڈنے لگ جاتا اور میں اپنی عزت چھپا چھپا کر بلکان ہو جاتی ہوں اسی لیے میں نے نوکری کر لی ماکہ مجھے سارا دن گھر پہ نہ رہنا پڑے لیکن کل شام کو جب میں واپس جا رہی تھی تو وہ اچانک کہیں سے آگیا اور مجھے ساتھ چلنے کا کہنے لگا اور میں نے اس کی زبردستی پہ اس کے منہ پہ تھن مار دیا تھا جس پہ مجھے

توقع امید تھی کہ وہ مجھے اور لیل کو گھر آکر خوب تنگ کرے گا، مارے گا، ہنگامہ اٹھائے گا، لیکن اس نے کچھ نہیں کیا، وہ کل رات سے خاموش ہے، سنا نہیں اب اس کی خاموشی کے پیچھے کیا راز ہے؟ کیا کرے گا وہ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

مانندہ روتے ہوئے سب کچھ بتاتی تھی اور دادی بی گم صم سی ہو کر رہ گئیں۔ ان کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوئے تھے۔ مانند کے آنسوؤں سے ان کا گھٹنا بھیگ چکا تھا۔

”مانندہ بی بی!“ عیشیل کی آواز پہ سوپ بناتی مانند نے لپٹ کر پیچھے دیکھا۔

”ہوں کمو۔“ اس نے دوپٹے سے ہاتھ پونچھے ہوئے کہا۔

”صاحب نے آپ کو اپنے کمرے میں بلایا ہے۔“ عیشیل نے پیغام پڑھایا۔

”صاحب نے۔“ مانند چند ٹائپ کے لیے ٹھک سی گئی۔ پھر اگلے ہی لمحے وہ خود کو سنبھالتی اقلن کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ پہلی بار اور اس کے کمرے کی طرف آئی تھی اس لیے جھجک بھی ہو رہی تھی لیکن کچھ دیر کے لیے شرم و جھجک کو بلائے طاق رکھ کر اس نے دروازے پر اک اعتماد بھری دستک دے ڈالی۔

”بس کم ان۔“ اندر سے سنائی دینے والی آواز گہمیر اور بے اتھارہ تھی۔ مانند کو اس آواز کا سر دین اپنے جسم و جان میں سہاوت کرتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ وہ اپنی تمام تر ہمتیں جمع کرتی دروازہ دھکیل کر اندر چلی آئی وہ اپنے کمرے میں زخمی شیری کی مانند دھڑلے سے رہا تھا اس کے ہاتھ کی انگلیوں میں سلگتا سرکٹ اس کے غصے کی نشاندہی کر رہا تھا۔

”السلام علیکم۔“ مانند نے سلام کیا لیکن وہاں سے سلام کا جواب نہ آیا۔

”بیٹھے مس مانند امین!“ اس نے ضبط کرتے

ہوئے کافی طنزیہ سے انداز میں صوفے کی سمت اشارہ کیا تھا۔

”تھنک یو سر!“ وہ شکر یہ ادا کرتے ہوئے صوفے پہ بیٹھ گئی تھی۔

”یقیناً“ آپ کو پتا ہو گا کہ میں نے آپ کو یہاں کس لیے بلایا ہے۔“ وہ سرکٹ کا گہرا پس لیتے ہوئے سرکٹ کو لپٹ کر رے میں مسل چکا تھا۔

”جی ہاں ہے مجھے۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”لیکن آپ کو یہ نہیں پتا کہ میں آپ کی ساری چال بازی سمجھتا ہوں۔“ اقلن کے لب و لہجے میں نفرت اور حقارت تھی۔ مانند نے یکدم چونک کے اسے دیکھا تھا۔

”چال بازی۔“

”ہاں چال بازی، جو آپ نے دادی بی کے سامنے کھیلی ہے، خود کو مظلوم اور غریب ظاہر کرتے ہوئے۔“

”سر! میں اگر کوئی چال بازی کر رہی ہوں تو دعا کرتی ہوں میرا آپ مجھے ابھی ابھی اس کی سزا دے اور دادی بی کے سامنے میں نے صرف اپنی زندگی کی کتاب کھول کے رکھی ہے اب اس کتاب کو پڑھ کے ان کے دل میں کیا خیال آیا ہے۔ اور کیوں آیا ہے اس کے بارے میں میں بھلا کیا کہہ سکتی ہوں؟ اس میں میرا کیا قصور ہے۔ آپ کو اگر یہ سب منظور نہیں تو انکار کر دیجیے۔ آپ کسی کے پابند یا محتاج تو نہیں ہیں ناں۔ محتاج تو مجھ جیسے اور دادی بی جیسے لوگ ہوتے ہیں جو کسی کے آسرے اور سہارے پہ جی رہے ہوتے ہیں۔“

مانندہ کا لہجہ بے بسی لیے ہوئے تھا۔

”مس مانند امین! میں ایموشنل بلیک میل ہونے والا آدمی نہیں ہوں، مجھے زندگی میں صرف ایک عورت نے بلیک میل کیا ہے، اس کے بعد دوبارہ نہیں ہو سکتا۔“ وہ یکدم غرا کے بولا تھا۔

”تو آپ کیوں ہو رہے ہیں ایموشنل۔ آپ نے جو بھی کام کرنا ہے ٹھنڈے دل و دماغ سے کریں۔“

”میں ٹھنڈے دل و دماغ سے کیسے کر سکتا ہوں سب؟ جبکہ دادی بی آپ کے حق میں بول رہی ہیں۔“

”ان کی بات ٹالنا کون سا مشکل ہے آپ کے لیے۔“

مانندہ کے اطمینان سے کہنے پہ وہ اور بھی مشتعل ہو گیا۔ اس نے صوفے کے پیچھے پہ ہاتھ جما کر مانند کی سمت جھٹکتے ہوئے اسے خونخوار نظروں سے دیکھا تھا۔

”مس مانند امین! مجھ سے شادی کرنے کے بعد اپنے عورت ہونے کا ہر روز تلوان بھرو گی تم۔ ہر روز اذیت دوں گا۔ ہر روز تڑپو گی۔ مجھ سے بھاگنے کی کوششیں کرو گی اور میں تمہیں بھاگنے نہیں دوں گا۔“ وہ اک اک لفظ چپا کر ادا کر رہا تھا اور مانند کے چہرے پہ اک بے بسی کی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی تھی۔

”مجھے منظور ہے سر!“ اس نے سب کچھ سینے اور برداشت کرنے کے لیے رضامندی دے دی تھی اور اقلن افروز اس کے اس فیصلے پہ جیسے یکدم چپ سا ہو گیا۔ مانند کے سنہری رنگت والے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے اس نے گہری سانس کھینچی اور سیدھے ہوتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔

”ٹھیک ہے آپ نکاح کی تیاری کریں۔“

اقلن نے بھی اپنا فیصلہ سنایا تھا جب تک دادی بی ٹھیک تھیں اقلن اپنی من مانی کرتا آیا تھا لیکن جب سے وہ ایکسپینڈنٹ کے بعد معذوری کا شکار ہوئی تھیں اقلن نے انہیں پریشان کرنا چھوڑ دیا تھا، وہ ان کی بات نہیں ٹالتا تھا اور دادی بی نے اس کی اسی سعادت مندی کا فائدہ اٹھایا، انہوں نے اقلن کے لیے مانند کا انتخاب کر لیا۔ اقلن راضی نہیں تھا مگر مانند جسے ایک گھر ایک سائین، ایک پناہ مل رہی تھی وہ انکار کیسے کرتی اور کیسے پیچھے ہتی۔۔۔ اقلن افروز اور بھی تھا جیسا بھی تھا اسے قبول تھا کیونکہ وہ اسے اپنا ام دے رہا تھا شیخ زمان سے پناہ دے رہا تھا چاہے غصے میں ہی سہی کم از کم اپنا تو رہا تھا ناں۔۔۔؟

”تھنک یو۔“ وہ کہہ کے باہر نکل آئی تھی۔

”مانندہ! کیا اقلن نے؟“ دادی بی کو عیشیل نے بتا دیا تھا کہ مانند اقلن صاحب کے کمرے میں گئی ہے اس لیے وہ اسی کے انتظار میں تھیں۔

”کہتے ہیں نکاح کی تیاری کریں۔“ مانند بے حد آہستگی سے بولی تھی۔

”ارے بچ۔۔۔؟ خوشی کے مارے ان کا چہرہ کھل اٹھا اور مانند ان کے قریب بیٹھتے ہوئے ان کے کندھے سے لگ گئی تھی!

حلیہ بی بی نے فرس اور حرا دونوں کو فون کر کے بلایا تھا۔ ان کے شوہر اور بچے بھی ساتھ آئے تھے۔ وہ سب ہی مانند کے نکاح پہ بہت خوش تھے اور اپنی اس خوشی کا اظہار بھی کر رہے تھے، البتہ شیخ زمان سب کے درمیان موجود ہوتے ہوئے بھی چپ اور گردن جھکائے بیٹھا تھا۔

”شیخ صاحب آپ کیوں چپ ہیں؟ آپ کی بیٹی رخصت ہو رہی ہے کچھ تو بولیں۔“

حرا کا شوہر وسم احمد ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بڑی اپنائیت اور لگاؤ سے بولا جس پہ شیخ زمان نے اسے محض اک نظر دیکھا، اور چڑو دوسری سمت پھیر لیا۔

”آپ کی طبیعت خراب ہے تو آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں“ وہ انہیں بولنے لگا، اکسا رہا تھا۔

”میری طبیعت ٹھیک ہے تم لوگ جو کر رہے ہو، کرتے رہو۔“ شیخ زمان نے وسم احمد کا ہاتھ اپنے کندھے سے جھٹک دیا۔

”ارے شیخ صاحب! آپ تو غصہ ہی کر رہے۔“ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ آپ غصہ کریں گے تو آپ کی بیٹیوں کی زندگی پہ اثر پڑے گا اور ایک نہیں دو، بیٹیوں کی زندگی خراب ہو گی، طلاق کا ٹیکا سجا کر گھر آئیں تو کیا جواب دیں گے لوگوں کو؟“

وسم احمد غصے سے چپ کر بولا تھا اور شیخ زمان ایک بار پھر چپ ہو گئے تھے۔ دسمن بی مانند امین کو تو یہ خبری

نہیں تھی کہ وہ سیم احمد کے لیے فرشتہ ثابت ہوا ہے۔ اس روز جب وہ شیخ زنان کو چھپوٹار کے بھائی تھی۔ سیم احمد بھی وہیں کھڑا یہ سب تماشا دیکھ رہا تھا۔ شیخ زنان نے ماندہ کے پیچھے بھاگنے کی اور اسے پکڑنے کی کوشش کی تھی لیکن اسے وہ سیم احمد نے قیص کے کالر سے پکڑ کے دو بچ لیا تھا وہ ساری صورت حال سمجھ چکا تھا اور اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ ماندہ کو یہ تھپڑ مہنگا بھی بڑ سکتا ہے اسی لیے اس نے شیخ زنان کی شیطانت کے سامنے اس کی بیٹی کو لاکھڑا کیا، سو تلی بیٹی کو بچانے کے لیے اس کی سگی بیٹی کی دھمکی دی کہ اگر اس نے دوبارہ ماندہ پر بری نظر ڈالی یا اسے تنگ کیا، حلیمہ بی بی کو کچھ کما تو وہ حرا کو طلاق دے کر گھر بھیج سکتا ہے اور جب باپ کے کڑوتے سامنے آئیں گے تو فرح کے سرال والے بھی اسے نکال باہر کریں گے اور یہی وجہ تھی کہ اس روز سے لے کر آج تک شیخ زنان خاموشی کی ہیکل مارے پھر رہا تھا۔ کب اقلن کا رشتہ آیا کب رشتہ طے ہوا اور کب شادی کا دن سر پہ آن پہنچا۔ اسے اس چیز سے کوئی دلچسپی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اس نے کسی کام میں مداخلت کی تھی۔ اللہ کا احسان تھا کہ سب کچھ بخیریت انجام پیا گیا تھا جس پر حلیمہ بی بی اور ماندہ بھی اندر ہی اندر حیران اور بے یقین ہو رہی تھیں مگر ساتھ ساتھ اللہ کا شکر بھی ادا کر رہی تھیں جس نے انہیں سرخرو کر دیا تھا اور وہ باعزت طریقے سے اپنے گھر کو رخصت ہو گئی تھی۔ وہ سیم احمد کی دھمکی سچھ کم نہیں تھی۔ شیخ زنان اپنی ہوس اور نفس کی آگ میں اپنی بیٹیوں کی زندگی برباد نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے بے بس ہو کر ہاتھ ملتا رہ گیا تھا۔

وہ مسلسل تین گھنٹوں سے دلہن بنی ایک ہی انداز میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی لیکن وہ اس کے انتظار سے بے خبر اور لا پرواہ نہ بنے کمال کم تھا کہ اپنے بیڈ روم میں آنے کا بھی ہوش نہیں تھا اور ماندہ بھی جیسے تیرہ کیے بیٹھی تھی کہ اس کے دیکھ بٹانہ تو چپچپ

کرے گی اور نہ ہی سوئے گی صبح کے چار بج چکے تھے جب وہ نشے میں غرق ہو جمل قدم اٹھاتا ہوا بیڈ روم میں داخل ہوا تھا اور اس کے بے ربط قدموں پر اس کی دل کی دھڑکنیں بھی بے ربط ہو گئی تھیں۔ اس کے تھکے تھکے اعصاب پر بچے جتنی نیند ایک دم سے ہوا ہو گئی تھی۔

وہ جو ذرا سا تنگہ کا سا رالے بیٹھی تھی اسے دیکھ کر فوراً سیدھی ہو بیٹھی۔ اقلن افروز بھی سیدھا بند کی سمت آیا اور اپنا موبائل فون جیب سے نکال کے بیڈ پر اچھالتے ہوئے خود بھی وہیں ڈھیر ہو گیا تھا۔ ماندہ بیڈ کے وسط میں بیٹھی ہوئی تھی اور وہ بیڈ پر اس کے سامنے آڑا ترچھا لیٹا ہوا تھا۔ اس نے تو ماندہ کو اک نظر دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی بلکہ آنکھیں بند کیے جیسے وہیں سوئے گی کوشش کر رہا تھا۔

”آپ یہاں آکر صبح سے سو جائیں۔ میں اٹھ جاتی ہوں۔“ ماندہ نے اسے ڈرتے ڈرتے اور دھڑکتے دل سے مخاطب کیا تھا۔

”اٹھنے کی کیا ضرورت ہے۔ بیٹھی رہو رات ابھی ختم نہیں ہوئی۔“ اقلن اپنے بالوں میں ہاتھ پھنساتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

”آپ تھکے ہوئے لگ رہے ہیں سو جائیں۔“ ماندہ کو اس کے منہ اور کپڑوں سے اٹھنے والی بو سے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ ڈر تک کر کے آیا ہے۔

”تم تو نہیں تھکیں ہیں؟“ اقلن نے اپنے ہاتھ سے اس کے گال کو تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا اور ماندہ کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

”اقلن! آپ یہ کیا...؟“

”مت نام لو میرا۔ برداشت نہیں ہو گا مجھ سے وہ بھی۔ وہ بھی اسی طرح نام لیتی تھی میرا۔ شادی کی پہلی رات بھی اس نے اسی طرح پکارا تھا اپنی۔ اپنی محبتوں کے یقین۔ جھوٹے یقین دلائے تھے اس نے جھوٹی تھی وہ اور تم بھی جھوٹی ہی ہو عیسیٰ کی طرح دھوکے باز، بے وفا اور مردکی دولت پہ ایمان ہو نہ! عورت کو صرف دولت ہی نظر آتی ہے چاہے وہ اقلن

افروز کی ہوا بھل پیر زاہد کی۔“
اقلن نفرت و حقارت سے بول رہا تھا اور مائدہ کا دل
وہیں بند ہو گیا، جہاں اس نے اپنی ”اس“ کا ذکر کیا تھا۔
آج کی رات بھی وہ اسی کا غم منارہا تھا۔ اسے سامنے
بیٹھی تھی سنوری دلہن، بنی مائدہ نظری نہیں آ رہی تھی
مائدہ کا دل جیسے کسی نے منہ میں لے کر مسل دیا
تھا۔ بے شک اس کی شادی کافی عجیب حالات میں ہوئی
تھی لیکن اس بچے پر آکر تو اس کے دل کے ارمان بھی
وہی ہو گئے تھے، جو باقی عام لڑکیوں کے ہوتے ہیں اور
اس کی آمد سے پہلے وہ انہی ارمانوں اور خوابوں کی محفل
سجائے بیٹھی تھی۔ لیکن اب!

”آپ کی طبیعت اس وقت ٹھک نہیں ہے۔ آپ
آرام کریں۔ میں پیچھے کر کے آتی ہوں۔“ مائدہ اپنا
دوپٹہ اور لنگنا سنبھالتی ہوئی بیڈ سے اترنے لگی۔
”کچھ نہیں ہوا میری طبیعت کو، میری طبیعت روز
ایسی ہی ہوتی ہے۔“ اقلن نے اس کی کلائی پکڑ کر
اسے روک لیا۔
”مطلب۔۔۔ آپ روز ڈرنک کرتے ہیں؟“ مائدہ
نے پریشانی سے بے ساختہ کہہ دیا تھا۔
”روز نہیں ہنس جب اسے دیکھتا ہوں۔“ وہ
استہزاء سے ہنسا تھا۔
”تو آج کہاں دیکھ لیا اسے۔؟“ حیرت تھی مائدہ
سوال سے سوال کر رہی تھی۔
”تمہارے اس روپ میں اس کمرے میں اس
بیڈ پر ہر جگہ وہی تو نظر آ رہی ہے۔ دھوکے باز جھوٹی
اور مکار عورت۔۔۔ دل چاہ رہا ہے اس بیڈ اور کمرے
سمیت تمہیں بھی آگ لگا دوں، تم سر تپا دوںی ہو۔“
اقلن افروز نے اسے پاؤں سے دوچو لیا تھا اور
مائدہ اپنے لبوں سے ابھرنے والی ہلکی سی آواز بھی دیا
گئی تھی۔

”اگر آپ کے سینے میں جلنے والی آگ اسی طرح
بھجتی ہے تو بجائیں مارں مجھے، ٹھنڈا کریں اپنے آپ
کو۔“ مائدہ نے اسے کھلی چھوٹ دی اور اقلن افروز
نے اسے اس چھوٹ کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اسے اپنی درندگی
اور وحشت کا نشانہ بنا کر وہ زیادہ تو نہیں لیکن چند لمحوں
کے لیے پرسکون ہو گیا تھا۔!

”السلام علیکم وادی بی!“ مائدہ فجر کی نماز پڑھنے کے
بعد سیدھی ان کے کمرے میں آئی تھی۔
”وعلیکم السلام! جیتی رہو، سنا کن رو، اتنی جلدی
کیوں اٹھ لیں؟“ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر مانتے پے
بوسہ دیتے ہوئے بولی تھیں۔
”نماز کے لیے ابھی ہوں اور مجھے پتا تھا آپ کی نماز
اکثر قضا ہو جاتی ہے اس لیے سوچا آپ کو بھی وضو کروا
دوں۔“ مائدہ کا لہجہ پرسکون تھا۔ بے شک اقلن افروز
نے رات بھر اسے لذت دینے میں کوئی کسر نہیں
چھوڑی تھی لیکن پھر بھی آج زندگی کی نئی صبح کا آغاز
کرتے ہوئے وہ مطمئن تھی وہ آزادی کی سانس لے
رہی تھی۔ وہ عزت سے سر اٹھا کے چل رہی تھی۔
آج اس پر کسی نے حق جتایا تھا تو وہ کوئی غیر اور نامحرم
نہیں تھا۔ اس کا اپنا شوہر تھا۔

”عیش! عیش! عیش! میرا ناشتا؟“ اقلن
آفس جانے کے لیے تیار ہو کر نیچے آچکا تھا اور
عیش کو آوازیں دے رہا تھا کہ ہمیشہ کی طرح وہ سن
ہی نہیں رہی تھی۔ اسی لیے اسے خود کچن میں جھانکنا
پڑا لیکن وہاں موجود ہستی کو دیکھ کر اس کے الفاظ جلد ہو
گئے تھے۔

”آپ بیٹھیں۔ میں ناشتا لے کر آ رہی ہوں۔“ وہ
برائے بنانے کے بعد سلاکس سینک رہی تھی۔
تو سڑند کرتے ہوئے اقلن کی سمت چلی تھی۔
”عیش! کہاں ہے۔؟“ اقلن نے بات بدل
دی۔

”وادی بی کو لینے گئی ہے، وہ بھی ہمارے ساتھ ہی
ناشتا کریں گی۔“ مائدہ نے اٹھا کر باہر جانے کے لیے
آگے بڑھی لیکن دروازہ میں استہزاء اقلن کو دیکھ کر
ٹھہر پڑا۔

”راستہ دیں پلیز۔“ مائدہ نے اسے مخاطب کیا تو وہ

یکدم چونک کر سامنے سے ہٹ گیا۔ اتنے میں
عیش بھی وا دی بی کی وہیل چیر کر حلیاتی ہوئی ڈانٹنگ
روم میں لے آئی تھی۔
”گڈ مرننگ۔!“ اقلن نے آہستگی سے کہا۔
”خوش رہو بیٹا!“ وا دی بی جواباً خوش دلی سے بولی
تھیں۔

”اتنے تار شیار ہو کر کہاں جا رہے ہو۔؟“ وا دی
بی نے اسے ٹکسک سے تیار دیکھ کر فوراً پوچھا تھا۔
”آفس۔“ اس کا مختصر سا جواب موصول ہوا۔
”آفس۔ کیا آج بھی آفس ضروری ہے؟“ وہ
حیران ہوئیں۔

”کیوں آج کیا ہے۔؟“ اقلن افروز نے یوں
جیڑائی ظاہر کی کہ وا دی بی چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ
سکی تھیں۔
”یہ چائے لے لیں وا دی بی!“ مائدہ نے ان لوگوں
کی خاموشی ختم کرنے کے لیے وا دی بی کو مخاطب کیا
تھا۔

”ہوں۔!“ انہوں نے محض ہوں یہ اکتفا کیا اور
تھوڑی دیر بعد اقلن ناشتا ختم کرتے ہی اٹھ کر چلا گیا تھا
وا دی بی نے اسے گاڑی تک پیچھے بھیجا تھا لیکن وہ
گاڑی نکلنے لگا تھا اور مائدہ ست قدموں سے واپس
پلٹ آئی تھی۔
”مائدہ!“

”جی وا دی بی۔۔۔؟“
”اوجھر کو میری بات سنو۔“ انہوں نے اسے اپنے
قریب بلایا تھا۔
”رات کو اقلن نے تمہیں کچھ کہا تو نہیں؟“ وہ
اسے کھنکھ رہی تھیں۔

”کہا ہے۔ کہتے ہیں مجھے اقلن مت کہا کرو،
کیونکہ وہ بھی اقلن ہی کہتی تھی، مائدہ نے استہزاء سے
انداز میں مسکرا کر کہا۔

”وہ بھی؟“ وا دی بی ابھیں۔
”جی ہاں! آپ بھی تو اسے اچھی طرح جانتی ہیں،
مائدہ نے ان کے چہرے کی سمت دیکھتے ہوئے کہا

اور پھر نظر جھکا کر اپنے ہاتھوں کے ماتحتوں سے کھیلنے
لگی۔

”ہاں جانتی ہوں۔ اچھی طرح جانتی ہوں اور جتنا
میں اسے جانتی ہوں یہ بے وقوف نہیں جانتا، اگر جان
لیتا تو اپنی زندگی کو اس طرح روک لگا کے نہ پھر رہا ہوتا۔
وہ منحوس، غم بخت خود تو چلی گئی لیکن اپنے پیچھے اس
کے لیے روک چھوڑ گئی۔“

وا دی بی کا خون کھول رہا تھا۔ چار سال ہو گئے تھے
لیکن اقلن افروز ان چار سالوں میں ذرا بھی آگے نہیں
بڑھا تھا وہیں یہ کھڑا آج تک اس کا غم منارہا ہے، جہاں
وہ اسے چھوڑ گئی تھی۔

”کیا اس روک کا کوئی علاج نہیں ہے وا دی بی!“
مائدہ نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

”ہے ناں علاج، اس دنیا میں ایسی کوئی چیز نہیں
ہے جس کا حل نہ ہو، جس کا علاج نہ ہو۔“ وہ ذرا سا
مسکرائیں۔

”کیا۔؟“
”تم۔ اس مرض کا علاج تم ہو، صرف تم۔ تمہیں
حوصلے، صبر اور برداشت سے کام لیتے ہوئے اسے اس
عورت کے حشرے نکالنا ہے۔ اسے اپنی طرف مائل
کرنا ہے۔ ایک ایسی بیوی بن کے رہنا ہے جیسی وہ
چاہتا تھا لیکن وہ نہیں بن سکی، اس لیے اب تمہیں
اس کی خواہش پوری کرنی ہے اور مجھے پتا ہے کہ تم میں
اچھی بیویوں والے سارے کن موجود ہیں۔“ وا دی بی
اسے ہلکی دے رہی تھیں۔

”لیکن وا دی بی وہ کہہ رہے تھے کہ وہ بہت زیادہ
خوب صورت تھی۔ میں تو اس کے مقابلے میں کچھ
بھی نہیں ہوں۔“

”ارے باگل۔۔۔! خوب صورت تو لی! بھی نہیں
تھی پھر بھی تمہیں مجنوں ہو کے رہ گیا تھا۔ تمہیں کس
نے کہا کہ تم خوب صورت نہیں ہو۔ جتنی پیاری اور
پرکشش تم ہو، اتنی تو وہ بھی نہیں لگتی تھی۔“

انہوں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے چمکتے ہوئے
کہا تھا اور اس کی ہمت بندھ جاتی تھی اور پھر وہ اس

کے صبر و برداشت میں ہی گزر گئے۔ اقلن افروز نے سفاکی اور سرد مہمی کی حد کر ڈالی تھی۔ وہ ہر وہ کام کرتا تھا جس سے مائدہ کو اذیت ہوتی لیکن وہ پھر بھی برداشت کر جاتی تھی سب سہہ جاتی تھی لیکن آج اقلن افروز کا بدلا ہوا رویہ اسے حیران کر رہا تھا۔

جب مین بال کے سامنے اس نے گاڑی کو بریک لگائے تو مائدہ نے جھک کر اقلن کی سمت دیکھا مگر وہ اس کی طرف دیکھے بغیر گاڑی سے اتر گیا تھا۔ مجبوراً سر جھٹک کر مائدہ کو بھی اترنا پڑا۔ وہ چھٹی سیٹ سے گفٹ اٹھا کے گاڑی لاک کر رہا ایک طرف آکر ہوا تھا اور مائدہ اپنے چکراتے دماغ کو سنبھالتی ہوئی بشکل اس کے قریب آئی تھی۔

”اقلن۔۔۔“ اس نے آگے بڑھتے اقلن کو بے ساختہ پکارا تھا اور اس کے قدم ٹھم گئے تھے۔

”ہوں۔۔۔؟“

”مہمہ مجھے چکر آرہے ہیں۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑے ٹشو سے اپنی پیشانی پر آیا پینٹ پونچھا۔ اچانک گاڑی سے اترتے ہی اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔

”اندر چلو میں ویٹر سے پانی منگوا تا ہوں۔“ اقلن پارکنگ میں نصب روشنیوں میں اس کے چہرے کی حالت نوٹ کر چکا تھا اسی لیے کچھ سخت کئے سے رہ گیا تھا۔

”لیکن اقلن! میرا پورا جسم کانپ رہا ہے۔“ مائدہ کی تو جیسے ٹانگوں میں جان ہی نہیں رہی تھی اور اوپر سے اس نے ہیل پن رہی تھی جس کی وجہ سے چٹنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ اقلن نے بے اختیار آگے بڑھ کے اسے اپنے بازو میں تھام لیا تھا۔

”مائدہ! تم ٹھیک تو ہو؟ کیا ہوا ہے تمہیں؟“ اقلن پریشان ہونے لگا۔

”مجھے پانی پلاؤں پلیز۔“ مائدہ پوری کی پوری اس کے سہارے پہ کھڑی تھی جیسے بے جان ہو چکی

ہو۔

”چلو اندر۔۔۔“ اقلن اسے سہارا دیے اندر کی طرف بڑھا۔ حسام انہیں دور سے ہی دیکھ کر لپک کے پاس آیا۔

”اقلن! خیریت بھابی کو کیا ہوا ہے۔؟“ وہ پریشانی سے پوچھ رہا تھا۔

”کچھ نہیں بس راستے میں ہی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔“ اقلن نے ہاتھ میں پکڑا گفٹ حسام کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”تم انہیں اندر لے آؤ۔ میں ڈاکٹر کو بلا تا ہوں۔“ اور پھر اقلن اور حسام اسے مین بال کے میک اپ روم میں لے آئے۔ حسام کی ای سی بھی وہیں آگئی تھیں۔ ڈاکٹر اس مین بال میں ہی دستاب ہو گیا تھا۔

”یہ شادی شدہ ہیں۔۔۔؟“ ڈاکٹر نے حسام کی ای کو دیکھا۔

”جی! یہ اس کے بھتیجہ ہیں۔“ انہوں نے سیاہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس اقلن افروز کی سمت اشارہ کیا۔

”تو پھر مبارک ہو آپ کو“ آپ پلا بننے والے ہیں۔“ ڈاکٹر صاحب مائدہ کی نبض اور بلڈ پریشر چیک کرنے کے بعد کھڑے ہو گئے تھے اور اقلن کو مبارکباد دے نوازا تھا۔

لیکن اقلن تو جیسے صدمہ سمسا ہو گیا تھا جبکہ حسام نے خوشی سے بھرپور غور لگایا تھا۔

”اوئے مبارک کل یار مبارک کل! میں چاچا بننے والا ہوں۔۔۔ آج تو ڈبل ڈبل خوشیاں منانی جا میں۔“ حسام اقلن کے گلے لگ گیا تھا۔ اس کی ای مائدہ کو مبارک دے رہی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کے دیے ہوئے انجکشن اور پانی پینے کے بعد مائدہ کی طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی اس کا پی پی او ہو گیا تھا اسی وجہ سے اس کا جسم اور ٹانگیں کانپ رہی تھیں لیکن اب طبیعت کافی بہتر ہو چکی تھی۔

”حسام! تم باہر آؤ مہمان آرہے ہیں اور تمہارے ڈیڑی بھی تمہارا ہی پوچھ رہے ہیں۔“ حسام کی ای

اسے اشارہ کرتے ہوئے باہر نکل گئیں اور حسام اس کا کندھا ٹھیک کے ان کے پیچھے ہی نکل گیا۔

مائدہ کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور اقلن کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اتنی بڑی خوشخبری سننے کے بعد بھی عجیب سی صورت حال تھی۔ وہ دونوں ہی خاموش سے ہو گئے تھے۔

”اٹھو ہم بھی نیچے چلیں۔۔۔“ اقلن نے گہری سانس کھینچتے ہوئے سر جھٹکا اور قدم باہر کی سمت بڑھا دیے۔

”اقلن۔۔۔!“ مائدہ نے ایک بار پھر اسے پکارا۔ اس کے قدم ٹھم گئے۔

”آپ خوش نہیں ہیں نا۔۔۔؟“ مائدہ کے سوال پر اقلن نے گردن موڑ کے اسے دیکھا وہ ابھی تک نظریں جھٹکائے بیٹھی تھی۔

”مجھے ابھی خوشی اور ناخوشی کا کوئی احساس نہیں ہوا جب ہو گا تمہیں بتا دوں گی۔“ اس نے دونوں کتے ہوئے بات ہی ختم کر ڈالی تھی اور مائدہ ایک بار پھر برداشت کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

اسے میڑھیاں اتر کر نیچے آنے میں اقلن کے سہارے کی ضرورت تھی اور وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر نیچے اتر رہا تھا۔ دونوں نے بلیک سوٹ پہن رکھے تھے حسام کے اشارے پر کئی کیمرے الرٹ ہو گئے تھے اور کئی فلیش ایک ساتھ چمکے تھے۔ ان کا یہ خوب صورت اور محبوبانہ سائڈز کیمروں کی آنکھوں میں ہمیشہ ہمیش کے لیے محفوظ ہو گیا تھا۔ کیمروں کے فلش کے دوران ہی عالیہ پر زائدہ نے بھی یکدم گردن موڑ کے میڑھیوں کی سمت دیکھا تھا اور اقلن افروز کے ہمراہ میڑھیاں اترتی لڑکی کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ ان دونوں کی جوڑی پلا کی خوب صورت لگ رہی تھی وہ جو کوئی بھی تھی اقلن افروز کے ساتھ خوب چمک رہی تھی۔ بہت سے لوگوں نے بے ساختہ سراہا تھا انہیں۔

”ارے عالیہ! اقلن افروز کی وائف کو دیکھا تم نے؟“ یار! اتنی چارنگ ہے وہ۔۔۔ دونوں کی جوڑی کمال کی ہے یار!“

عالیہ کے ساتھ کھڑی شہرینہ نے برملا تعریف کی تھی اور ایک بل کے لیے تو عالیہ کے دل میں بھی حسد کی لہر دوڑ گئی تھی۔

”مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے کیا۔۔۔؟“ عالیہ نے اترا کے کہا۔

”تم سے زیادہ خوب صورت ہے یا نہیں لیکن اس وقت محفل کی جان لگ رہی ہے دیکھو کئی لوگوں کی نظریں اسی پر جمی ہوئی ہیں۔“ شہرینہ نے کوئی بھی لگی لٹی رکھے بغیر مائدہ کو سراہا تھا۔

”اس نے شادی کب کی۔۔۔؟“ عالیہ کے بغیر نہیں رہ سکی تھی اور پاس سے گزرتے حسام نے اس کی بات سن لی تھی اسی لیے ٹھہر گیا تھا۔

”ارے مسز پر زائدہ! آپ کو اقلن کی شادی کا نہیں پتا۔ اس کی شادی کو تو تین ماہ ہونے کو آئے ہیں اور اب تو وہ پلا بننے والا ہے بہت لگی جاہت ہوئی ہیں مائدہ بھابی۔ اقلن کی زندگی میں خوشیاں لے کر آتی ہیں بہت خوش ہیں دونوں۔“ حسام نے لگے ہاتھوں سب کچھ بتا دیا تاکہ اسے جلا سکے کہ اس کے بغیر بھی اقلن افروز خوش باش زندگی گزار رہا ہے۔

”کل تو مسٹر اقلن کی کوئی خوشی نظر نہیں آ رہی تھی؟“ عالیہ نے کیٹے انداز سے کہا۔

”ہوں! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں وراصل کل مائدہ بھابی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ پریشان تھا اور اسی لیے جلدی چلا گیا تھا۔ وہ بھی اسی وجہ سے کل شادی کے فنکشن میں نہیں آ سکی تھیں۔“ حسام اطمینان اور سکون سے جھوٹے جھوٹ بولے جا رہا تھا۔

”اوہ! تو یہ بات تھی۔۔۔؟“ عالیہ نے ہونٹ سکپڑتے ہوئے کہا۔

”تو آپ کیا سمجھی تھیں۔۔۔؟“ حسام اسے زچ کر رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا عالیہ کو اٹھا کر کہیں جنگل میں پھینک آئے۔ اس نے اس کے دوست کی زندگی برباد کر کے رکھ دی تھی۔

”کچھ نہیں۔۔۔“ اس نے نخوت سے سر جھٹک دیا

تھا۔

”لوکے! لہکسکیوزی!۔“ حسام وہاں سے ہٹ گیا تھا اور پھر اس نے اپنی اور عالیہ کی باتوں کی ریکارڈنگ جو اس نے اپنے موبائل فون سے کی تھی وہ جا کر اقلن افروز کو سنا دی۔ اقلن کے دل کو نچانے کیوں سکون پہنچا تھا اور چہرے پہ خوشی کا احساس بکھر گیا تھا۔ عالیہ کو اس کی بیوی سے حسد محسوس ہوا تھا اور یہی تو وہ کرنا چاہتا تھا۔

”اب بولو۔“ حسام اسے فتح مندی سے دیکھ رہا تھا۔

”گرٹ یا ر! تم بہت چالاک اور سمجھ دار ہو۔“ اقلن نے اسے ٹھیکری دی۔

”اسی لیے تو تمہیں مشورہ دے رہا ہوں کہ ماندہ بھابھی کے ساتھ رہو، ان کا خیال رکھو، اسی میں تمہاری عزت اور بھلائی ہے۔“ حسام اسے مشورہ دے کر خود اسٹیج کی سمت آیا جہاں اس کی اپنی دلہن براجمان تھی۔

”ہائے!“ عالیہ اور شہینہ ماندہ کے قریب آکر ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولیں۔

”السلام علیکم۔“ ماندہ نے ٹھٹک کر ان دونوں کو دیکھا۔ دونوں نے ساڑھیاں پہن رکھی تھیں کمر اور بازو پر بندھے، ریشمی سلکی ساڑھیوں کے ڈھلکتے ہوئے پلو انہیں پلیٹ میں سجی ہوئی دعوت کا سا روپ دے رہے تھے وہ اس محفل میں موجود تمام مردوں کے لیے راحت بنی ہوئی تھیں۔

”آپ کون۔“؟“ ماندہ نے حیرانی کے باعث پوچھ ہی لیا تھا کیونکہ اس فنکشن میں موجود تمام لوگ اس کے لیے اجنبی تھے سوائے حسام کی فیملی کے۔

”کیا اقلن نے کبھی میرا ذکر نہیں کیا آپ سے؟“ عالیہ کے انداز پر ماندہ بری طرح چونک گئی تھی۔ اور وہ لمحے کے ہزاروں حصے میں پہچان گئی کہ وہ عالیہ ہے لیکن ماندہ بےوقوف نہیں تھی جو اس غبیث عورت کو خوشی کا موقع فراہم کر رہی یا پھر اسے شہیدیتی اس لیے اس نے لائعلی کا اظہار کیا تھا۔

”اتنی اہم سوری! میں یہاں پہلی بار آئی ہوں مجھے نہیں پتا آپ کون ہیں، آپ اپنا تعارف خود کروا دیں۔“

”میں اقلن افروز کی ایکس وائف ہوں عالیہ پیرزادہ۔“ اس نے جیسے تحریر انداز میں تعارف کروایا تھا۔

”اوہ اچھا! تو آپ ہیں عالیہ۔“ ماندہ نے ذرا سا مسکرا کر اس سے ہاتھ ملایا تھا۔

”جی جی ہے عالیہ! اقلن افروز جیسے بڑے کی قیمت نہ پہچاننے والی۔“ شہینہ طنز بولی تھی اور عالیہ نے اسے کھور کے دیکھا۔

”لہکسکیوزی! یہاں کیا ہو رہا ہے۔“ اقلن افروز عالیہ کو ماندہ کی ٹیبل کے قریب کھڑے دیکھ کر فوراً پاس چلا آیا۔

”آپ کی وائف کے ساتھ دعا سلام اور تعارف ہو رہا ہے۔“ شہینہ نے جواب دیا۔

”اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں کافی ہے۔“

اقلن افروز ان چار سالوں میں پہلی مرتبہ عالیہ کے سامنے رو برو آکر ہوا تھا اور نہ وہ جہاں بھی اسے دیکھتا تھا محفل چھوڑ جاتا تھا۔

”ہوں یہ تو آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔“ شہینہ نے سر ہلایا تھا۔

”آو ماندہ! حسام اسٹیج پر بلا رہا ہے تصویر بنوانے کے لیے۔“ اقلن نے اس کے گرد بازو پھیلاتے ہوئے کہا اور ان دونوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اسٹیج کی سمت بڑھ گیا۔ عالیہ کے ساتھ ساتھ ماندہ بھی دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس نے اقلن کے ایسے روپ کہاں دیکھے تھے بھلا۔ اس نے تو آج تک ماندہ پر قسم ہی ڈھائے تھے۔ ایسی کرم نوازیوں اور عنایتوں سے تو وہ انجان ہی تھی اسی لیے اپنے ساتھ چلتے اقلن کو حیرانی اور حسرت سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے احتیاط سے صوفے پر بٹھا کر خود بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا۔

عالیہ دور کھڑی دیکھ رہی تھی!

”آج تو آپ بہت خوش ہوں گے۔“ رات کے جب ماندہ لباس پہنچ کر کے بستر پر اتنی تو اقلن تکلی سے ٹیک لگائے بیٹھا ابھی تک جاگ رہا تھا اور ماندہ جو دل میں تھا، کئے بغیر نہ سکی تھی۔

”کس لحاظ سے کہہ رہی ہو۔“ اقلن نے اس کی طرف کروٹ بدلتے ہوئے کہا اور نظریں اس کے چہرے پر جمائیں۔ ماندہ بھی اس کی سمت دیکھ رہی تھی۔

”جس وجہ سے آپ مجھے فنکشن میں لے کر گئے تھے۔“ ماندہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑبڑایا کہا اور اقلن اس کی بات سن کر بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔

”اس کا مطلب ہے کہ بہت ذہین اور سمجھ دار ہوں تم۔“

”اگر آپ نے کسی کو جلا کر خوش ہونا تھا تو بہت پہلے ہو جاتے۔“

ماندہ کی بات پر اقلن نے لب بھینچ لیے تھے۔

”کیا بات ہے آپ چپ کیوں ہو گئے؟“

”کچھ نہیں سوچا۔“ وہ کہہ کر کروٹ بدل گیا اور ماندہ اس کی چوڑی پشت کو گھورنے لگی لیکن دل ہی دل میں قدرے خوش ہو رہی تھی کہ آج اس نے ڈرنک نہیں کی تھی حالانکہ وہ جب بھی عالیہ کو کہیں دیکھتا تھا اس روز ڈرنک کر کر کے اپنا برا حال کر لیتا تھا لیکن آج!

آج اگر اقلن خوش ہوا تھا تو ماندہ بھی خوش ہو رہی تھی اسے امید ہو چلی تھی کہ وہ بدل جائے گا وہ بڑی کی طرف لوٹ آئے گا اور یہی احساس اس کی سکون بھری نیند کا باعث بن گیا تھا۔!

وہ ابھی آفس میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ اچانک حسام کی گال آگئی۔

”آج کا اخبار پڑھا تم نے؟“

”نہیں! ابھی تو آیا ہوں۔“

”اوکے! تم اخبار پڑھو میں تمہیں پھر فون کرتا ہوں۔“

حسام نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور اقلن الجھ کے رہ گیا، پھر اپنی سیکرٹری کو اخبار بھیجنے کا کام پندہ سینڈ بعد اخبار اس کے سامنے تھا۔ عالیہ کی طلاق کا پڑھ کے وہ پکا نکارہ گیا تھا۔ جمل پیرزادہ نے اسے طلاق دے دی تھی کیونکہ جمل پیرزادہ کے دل پر کوئی اور لڑکی چڑھ گئی تھی۔ عالیہ نے احتجاج کیا اور جمل پیرزادہ نے اسے طلاق دے کر فراق کر دیا۔

اقلن اخبار ٹیبل پر رکھ کے چپ چاپ بیٹھ گیا تھا اس کے دل و دماغ میں جھکڑے چل رہے تھے اسے حیرت ہو رہی تھی کہ ایک غریب سے گھر میں رہنے والی عالیہ دولت کے لالچ میں کہاں جا پہنچی تھی۔ پہلے اس نے اقلن افروز سے محبت کی ٹینکس بڑھائیں۔ اسے شادی سے پہلے ترقی کی طرف راغب کیا اور وہ تو تھا ہی اس کا دیوانہ اس کی خاطر دولت کمانے کے لیے اپنی داوی لی کو چھوڑ کے امریکا چلا گیا واپس آیا تو کافی حد تک کامیاب ہو چکا تھا اور عالیہ سے شادی کرنے کے بعد تو وہ جیسے خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھنے لگا تھا لیکن پھر عالیہ کو اس سے بھی زیادہ کامیاب آدمی مل گیا تھا۔

یورو کرٹ جمل پیرزادہ اس کی خوب صورتی پر فدا تھا اور عالیہ اس کی بے تحاشا دولت پر۔ اسی لیے عالیہ نے اسے چھوڑ کے جمل پیرزادہ کو ترجیح دی تھی۔

اقلن نے اس عورت کی بے وفائی اور چال بازی کو اپنی ذات پر طاری کر لیا تھا۔ اس نے چار سالوں میں اتنا کمایا تھا کہ اب وہ جمل پیرزادہ سے کہیں آگے تھا عالیہ بھی یہ بات جانتی تھی لیکن اب واپس ملنے کا کوئی راستہ نہیں تھا کیونکہ وہ اب اس سے نفرت کرتا تھا بلکہ اس سے ہی نہیں تمام عورتوں سے نفرت کرتا تھا۔ اور اسی نفرت نے اسے آج تک ماندہ کے قریب نہیں ہونے دیا تھا۔ ایک عورت کا بویا ہوا بیج دوسری عورت کٹ رہی تھی۔

وہ یکدم کرسی دھکیل کے اٹھا اور اپنا موبائل چلیاں وغیرہ اٹھا کر تیزی سے باہر نکل گیا اس کا رخ اپنے گھر کی جانب تھا وہ بہت رش ڈرائیو کرتا ہوا گھر پہنچا تھا۔

داوی لی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی مائدہ انہیں ناشتا کروانے کچھ دیر سونے کا کہہ کے خود عیشاں کے ساتھ مل کر صفائی کرنے لگی تھی، حالانکہ ایسے کام کرتے ہوئے اسے کافی چکر اور ابکائیاں آتی تھیں لیکن پھر بھی وہ کام میں لگی رہتی اس وقت بھی اسے بہت زور کی تے آئی تھی اور وہ اپنے بیڈ روم کی طرف بھاگی تھی۔ عیشاں اسے دیکھ کر مسکرا دی۔ اسے بھی پتا تھا کہ گھر میں ایک رونق آنے والی ہے داوی لی کے ساتھ ساتھ عیشاں بھی بہت خوش تھی لیکن وہ خوش نہیں تھا جس کی وجہ سے یہ رونق آ رہی تھی۔

”مائدہ کہاں ہے؟“ اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی استفسار کیا تھا۔
”وہ تو اور اپنے کمرے میں ہیں صاحب جی!“
عیشاں نے چونک کر جواب دیا تھا۔
”ہوں۔۔۔!“ وہ سر ہلا کے لمبے لمبے ڈگ بھرتا میزھیاں چڑھ کے اور بیڈ روم میں چلا گیا تھا۔ ہاتھ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر سے اس کے ابکائیاں کرنے کی آواز آرہی تھی۔
وہ کمرے میں ٹپکتے ہوئے اس کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے انداز میں اضطراب تھا۔ وہ دائیں بائیں ٹپکتے ہوئے کافی مضطرب اور مشتعل لگ رہا تھا۔ مائدہ تھکی تھکی نڈھال سی ہاتھ روم سے باہر نکلی تھی تو اقلن کو دیکھ کر ٹھٹھکی گئی تھی۔

”آپ کب آئے۔۔۔؟“ وہ تو لمبے سے چڑبچہ کر وہیں بیڈ پہ بیٹھ گئی۔ فقاہت کی وجہ سے اس کا پورا جسم لرز رہا تھا وہ بغیر دوپٹے کے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ایسی نڈھال ہو رہی تھی کہ دوپٹے کا بھی ہوش نہیں تھا۔
”میں تم سے کچھ کہنے آیا ہوں۔“ اقلن کالب و لہجہ پہلے کی طرح سرد اور اجنبی ہو رہا تھا۔
”مجھے سے۔۔۔؟“ مائدہ نے چونک کر دیکھا تھا۔

”دیکھو! اگر تم اس گھر میں رہنا چاہتی ہو تو تمہیں میری بات مانی ہوگی، ورنہ تمہاری اس گھر میں کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔“ اقلن نے بات شروع کرنے سے پہلے ہی صورت حال سنگین کر ڈالی تھی۔

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔؟“ مائدہ اس کی بات پر پریشان ہوا تھی۔
”میرے ساتھ ہسپتال چلو۔“ وہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا تھا۔

”کیوں؟“
”میں بچہ نہیں چاہتا۔“
اقلن کی بات پر جیسے گھر کی چھت مائدہ کے سر پہ آن گری تھی۔ وہ سکت و صامت سی دم بخود رہ گئی تھی۔

”اقلن آپ۔۔۔ آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟“ وہ کہتے ہوئے رو پڑی تھی۔

”کیونکہ تم سب عورتیں ایک جیسی ہوتی ہو۔ اس نے بھی مجھ سے دولت کے لیے شادی کی۔ تم نے بھی میری دولت اور میرا گھر دیکھ کے شادی کی۔ اسے بھی کوئی اور مل گیا، تمہیں بھی کوئی اور مل جائے گا۔“

”شٹ اپ اقلن۔۔۔ جسٹ شٹ اپ! اس نے کہا آپ سے کہ ساری عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں؟ اگر ساری عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں تو سارے مرد بھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ذلیل، کمینے، ٹھٹھا، ہوس زدہ اور نفس پرست۔“

”کیا اس بند کرو اپنی۔“ اقلن نے اسے ایک زنانے دار پھڑپھڑا رہا تھا۔

”یہ کیسا آپ کو سنی بڑے گی۔ میں نے آپ سے شادی آپ کی دولت اور گھر دیکھ کر نہیں کی تھی بلکہ ایک مضبوط چھت دیکھ کر کی تھی۔ ایسی چھت جو مجھے چھپا سکتی، جو مجھے پناہ دے سکتی کیونکہ میں ایک مرد کی ستانی ہوئی تھی اور مرد بھی وہ جو میرا سوتیلا باپ ہونے کا اعزاز رکھتا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ میں ایک مرد سے چھپ کے دوسرے کے پاس پناہ لے رہی ہوں تو وہ بھی کچھ کم اہانت نہیں دے گا مجھے۔ وہ بھی مجھے

عورت ہونے کی سزا دے گا۔۔۔ طعنے دے گا، گھر سے نکالے گا، میرے سر سے چھت چھین لے گا۔ مجھے پتا ہوتا تو میں کسی مرد کے پاس پناہ لینے کے بجائے خود کشی کر لیتی۔“

مائدہ کہتے ہوئے زار و قطار رو رہی تھی اور اقلن شدید رسالے دیکھ رہا تھا۔ سوتیلا باپ۔۔۔؟ اس کے ذہن میں بس ایک ہی نام گردش کر رہا تھا۔

”ہاں! سوتیلا باپ، آپ جیسا ایک اور مرد، مجھ پر بری نظر رکھنے والا گھر میں ہی میرے لیے ٹاک لگائے بیٹھا رہتا تھا، اسی سے بچنے کے لیے میں نے نوکری کی، اسی لیے میں نے آپ سے کہا تھا کہ میرے لیے کام ضروری ہے، تنخواہ نہیں۔ آپ مجھے بے شک تنخواہ نہ دیں میں پھر بھی کام کر لوں گی کیونکہ میں اس خبیث آدمی کی نظروں سے اوجھل رہنا چاہتی تھی۔ اسی لیے میرا گھر واپس جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ میں دانستہ لیٹ ہونے کی کوششیں کرتی تھی تاکہ میرا اس سے سامنا نہ ہو اور اسی لیے میں نے سوچا کہ میری شادی ہو جائے، میرا خیال تھا کہ سارے مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ایک مرد کے کیے کا الزام میں دوسرے مرد کو کیوں دوں۔۔۔؟ دو سرا اچھا بھی تو ہو سکتا ہے اور اسی اچھے کے بھروسے پہ میں نے آپ پہ اعتبار کر لیا، میں نے تو آج تک آپ سے یہ نہیں کہا کہ سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔۔۔؟ ایک سے بھاگ کے دوسرے کے پاس پناہ لی ہے تو وہ بھی مجھے یہ ستم ہی کر رہا ہے۔؟ میں تو صبر اور شکر سے آپ کے سارے ستم سہہ رہی ہوں تو پھر آپ کو الزام دیتے ہیں کہ ساری عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں؟

اور رہا میرا اور عالیہ کا فرق تو یہ فرق آپ سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا۔ اسے در در پھر کے عداوت ہوگی، لیکن مجھے ایک ہی گھر اور ایک ہی چھت تلے رہنے کی لگن ہے۔ آپ کے سوا کسی اور کا مجھے دیکھنا بھی گوارا نہیں۔ اور ہاں اس بچے کی آپ کی نظر میں کوئی اہمیت نہ سہی، لیکن میرے لیے یہ بہت اہم ہے۔ ایک ہی تو میرا پناہ ہو گا، آپ مجھے گھر سے نکالیں

گے تو نکل جاؤں گی، کیونکہ میرا۔۔۔ میرا۔۔۔ اور کوئی نہیں ہے اس کے سوا۔۔۔ نہ میری ماں میری ہے اور نہ آپ میرے ہیں، آپ تو صرف عالیہ کے روٹی ہیں، صرف یہ میرا ہے۔ اس کی خاطر چھوڑ دوں گی آپ کا گھر بھی اور آپ کو بھی۔“

وہ روٹی بکٹی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تھی اور اقلن افروز دم بخود سا کھڑا تھا۔!

دروازے پر خاصی زوردار قسم کی دستک ہوئی تھی اور واوی لی جان نہیں کہ دروازے پر کون ہے۔؟ اسی لیے انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے صبح پڑھتی رہیں۔ وہ بھی جانتا تھا کہ اندر سے کوئی جواب موصول نہیں ہو گا اسی لیے دروازہ دھکیل کر خود ہی اندر آیا تھا۔

”السلام علیکم واوی لی!“

”وعلیکم السلام۔!“ انہوں نے جیسے نہ چاہتے ہوئے جواب دیا تھا۔

”کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔؟“ وہ ان کے بیڈ کے قریب رکھی کرسی کی سمت اشارہ کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”نہیں۔ تمہاری اس کمرے میں کوئی مہمان نش نہیں ہے، چلے جاؤ یہاں سے۔“ انہوں نے غصے سے کہا۔

”واوی لی پلیز! میری پوری بات تو سن لیں۔“ اقلن نے لجاجت سے کہا۔

”مجھے کچھ نہیں سنتا، میں اتنے سالوں سے سنتی ہی تو آ رہی ہوں۔“

”واوی لی! ایم سوری، ایم ریلی سوری! پلیز واوی لی! میں شرمندہ ہوں اپنی سوچ پر۔“

اقلن ان کے بیڈ پر ان کے قریب ہی سر جھکائے بیٹھ گیا۔

”تم نے کبھی اچھا سوچا ہو تا تو تمہیں یوں شرمندہ نہ ہونا پڑتا اور تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ ماں بھی عالیہ

جیسی ہی ہے، تم شاید یہ بھول گئے تھے کہ وہ تمہاری پسند میں اور ماں میری پسند ہے، وہ عالیہ جیسی ہوتی تو اپنی عزت بچانے کے لیے یوں پناہ نہ ڈھونڈ رہی ہوتی۔“

واوی لی کو اقلن پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ خوب دل کی بھڑاس نکال رہی تھیں۔

”جی! میں یہ فرق اچھی طرح جان گیا ہوں اسی لیے ماں کو لینے کے لیے آیا ہوں۔“ اس نے بالاخر اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا۔

”تم اب جو بھی کہو لو وہ تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔“ واوی لی نے سختی سے انکار کر دیا تھا۔

”واوی لی پلیز! آپ کو تو کم از کم میرا کچھ خیال کرنا چاہیے۔ ایک مدت کے بعد مجھے اپنی بیوی اچھی لگ رہی ہے تو آپ کیوں اسے مجھ سے دور رکھنا چاہتی ہیں؟“ وہ جھنجھلا کے بولا تھا۔

”کیونکہ مجھے تم پر اعتبار نہیں رہا، تم اپنے بچے کو کوئی بھی نقصان پہنچا سکتے ہو۔“

واوی لی کی بے اعتباری پر اقلن یکدم قہقہہ لگا کے ہنسا تھا اور ساتھ ہی واوی لی کے گلے میں دونوں بازو ڈالتے ہوئے انہیں اپنے ساتھ لگایا تھا۔

”کون کافر اپنے بچے کو نقصان پہنچا رہا ہے؟ وہ تو محض غصہ تھا، آپ کو نہیں بتا مجھے بچے کتنے پسند ہیں؟“ وہ خوش ہو کر کہہ رہا تھا اور واوی لی اپنے بوتے کے چہرے پر جچی خوشی کے رنگ دیکھ کر مطمئن ہو گئی تھیں۔

”یہ لکٹی ہوئی ہے ماں، لے جاؤ اسے اجازت ہے میری۔“ واوی لی نے اپنے بیڈ کی دوسری سائیڈ پر اشارہ کیا تھا، جہاں ماں کافی دیر سے کھیل میں دبی ہوئی نیند کا مہانہ کیے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

”یہاں۔؟“ اقلن کو حیرت ہوئی تھی اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تھا لیکن ماں یونسی پڑی رہی بے حس و حرکت۔

”ٹھہرا میں تھلا۔“ اس نے واوی لی کو کہا۔

”تم خود اٹھا لو۔“ واوی لی نے اسے کہا۔

”واقعی۔ میں سچ سچ اٹھا کر لے جاؤں گا پھر۔“

”لے جاؤ۔“ وہ اجازت دے رہی تھیں۔

”واوی لی! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ ماں یکدم کھل پرے دھکیل کے اٹھ بیٹھی تھی اور اقلن کے ساتھ ساتھ واوی لی بھی کھل کے فٹ دیں۔

”لو اٹھ گئی ہے۔“ انہوں نے اشارہ کیا۔

”تھینک یو۔!“ اقلن ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اٹھا اور ماں کی طرف آ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

ماں واوی لی کے سامنے اس کی ایسی حرکت پر جھینپ گئی تھی۔

”میرا ہاتھ چھوڑیں۔“

”چھوڑنا ہوں، چھوڑنا ہوں، پہلے تم اٹھو تو سہی۔“ اقلن دروازے کی سمت بڑھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”اوکے واوی لی! گڈ نائٹ، صبح ملاقات ہوگی۔“ وہ انہیں گڈ نائٹ کہہ کر ماں کو ننگے پاؤں کھینچتا ہوا اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے آیا تھا۔

”اگل ہو گئے ہیں آپ۔ یہ کیا کر رہے ہیں؟“ واوی لی کیسواپس کی؟

ماں خفگی سے بولی تھی اور اقلن نے بیڈ روم کا دروازہ بند کرتے ہوئے اسے مسکرا کے معنی خیز نظروں سے دیکھا تھا۔

”پہلے اگل تھا، اب تو میں ہوش میں آیا ہوں۔“

میرے ہوش و حواس سب تمہارے نام۔“

”آپ کے ہوش و حواس کا کیا اعتبار؟ بچا جانے کب آپ ڈرنک کر کے کنواؤں۔!“

”تمہاری قسم! اب تمہیں کڑوں لگے۔“ اس نے کان پکڑے اقلن کے جواب پر ماں کا دل یکدم پُرسکون ہو گیا تھا۔

”اور ہاں تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے آج کے اخبار میں، صرف عالیہ کی طلاق کا ہی نہیں بلکہ کچھ اور بھی لکھا ہوا تھا۔“

”کیا لکھا ہوا تھا۔؟“ ماں جلدی سے بولی۔

”سچ زبان کو جیل ہو گئی ہے۔“ اس نے اطمینان سے بتایا۔

”سچ زبان کو جیل۔۔۔؟“ ماں بری طرح چوکی تھی۔

”ہاں اس نے محلے کی کسی لڑکی کو بہانے سے گھر میں بلا کر اس کے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش کی تھی وہیں تمہاری امی آ گئیں اور شور مچا دیا، جن کی بیٹی تھی وہ پولیس لے آئے اور سچ زبان کو جیل بھیج دیا۔“

”اوہ خدا! پھر امی تو کافی غیر محفوظ ہوئی؟ وہ اگر جیل سے آیا تو امی کو نقصان پہنچائے گا۔“ ماں کو اب حلیمہ بی بی کی فکر ستا رہی تھی۔

”نہیں پنچائے گا، کیونکہ میں کل ہی اتنی کو اپنے گھر لے آؤں گا۔ اور اس کیلئے یہ ایسا کیس کروں گا کہ کبھی باہر کی ہوا بھی نہیں لے گا۔“ اقلن نے جیسے اپنا فیصلہ سنایا اور ماں مارے خوشی اور تشکر کے۔

یہ ساختہ اقلن کے سینے سے لگ گئی تھی۔

”تھینک یو اقلن! تھینک یو سوچ۔“

وہ رو رہی تھی اور اقلن نے اسے اپنی پناہوں میں لے لیا تھا۔ اس کی خوشی بھرے آنسو اقلن کے سینے میں جذب ہو رہے تھے اس نے ماں کے ہاتھ پر استحقاق بھرا بوسہ دیا تھا اور اپنا حصار اس کے گرد اور بھی مضبوط کر دیا تھا۔ جس پر وہ اللہ کا شکر بجالاتی تھی۔
